نصرۃ میگزین

نصرۃ میگزین شمارہ 52
جنوری / فروری 2020 بمطابق
جمادی الاول / جمادی الثانی 1441 ہجری

مغربی تہذیب بحران کا شکار ہے

جنرل باجوہ کا مخمصہ

قومی ریاست کی سوچ اور انسانیت پر اس کے تباہ کُن اثرات

اللہ سبحانہ وتعالی کی رضا کے لیے صالح لوگوں کی دوستی اور صحبت اختیار کرنا

"نئے پاکستان کے تجربے" کی ناکامی

حزب التحریر ولایہ بنگلادیش کی ریلیاں!

بھارتی 'ہندوتوا' جارحیت کے سامنے حسینہ واجد حکومت کا بزدلانہ طرزِ عمل

نصرة

میگزین / شمارہ 52

جنوری/فروری 2020 بمطابق جمادی الاول/ جمادی الثانی 1441 ہجری

اس شمارے میں

نظام کی ناکامی نظام کی تبدیلی کو لازم کر دیتی ہے	اداریہ	1
تفسیر سورۃ البقرۃ 196	شیخ عطاء بن خلیل ابوالرَشتہ	2
اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کے لیے صالح لوگوں کی دوستی اور صحبت اختیار کرنا	مصعب عمیر	7
مغربی تہذیب بحران کا شکار ہے	انجینئر معیز	11
مغربی اخلاقیات کی حقیقت اور اس کی فکری بنیادیں	عثمان عادل	15
"نئے پاکستان" کا تجربہ بھی باقی جمہوری تجربوں کی طرح اپنے انجام کو پہنچ---	حزب التحریر ولایہ پاکستان	21
جہاد کیا ہے؟ (1)	محمد عمران	24
بھارت میں بابری مسجد مقدمہ اور اسلامی نقطہ نظر	ریاض بن ابراہیم	30
قومی ریاست ایک رَجعت پسندانہ سوچ، انسانیت پر اس کے تباہ کُن اثرات	بلال المہاجر	34
جنرل باجوہ کا مخمصہ	خالد صلاح الدین	38
خلیفہ بننے کے لیے درکار شرائط میں "اہلیت" کا مطلب	سوال وجواب	41
سونے اور چاندی کے ذخائر کو استعمال میں لانا	سوال وجواب	42
اسلام میں محصن (شادی شدہ) زانی کی سزا	سوال وجواب	43
بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کے بھارتی 'ہندوتوا' اور حسینہ واجد کی حکومت کی مودی سرکار کے سامنے---	میڈیا آفس ولایہ پاکستان	47

اداریہ: نظام کی ناکامی نظام کی تبدیلی کو لازم کر دیتی ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جنرل باجوہ کو چھ ماہ کی توسیع مل جانے کے بعد ایک جانب اقتدار کے ایوانوں میں زبردست خوشی کی لہر دوڑ گئی جس نے پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد ان کی مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع کے لیے راستہ ہموار کر دی ہے تو دوسری جانب مسلمانوں میں عمومی طور پر شدید مایوسی کے جذبات پیدا ہوئے۔ جنرل باجوہ کو ایک ایسے فرد کے طور پر دیکھا جاتا ہے جنہوں نے عمران خان کے سیاسی مخالفین اور میڈیا کو زبردست دباؤ میں رکھ کر انہیں اقتدار کی کرسی پر بٹھایا۔ اس طرح جنرل باجوہ نے خود کو ایسے پیش کیا کہ وہ حکومت کی انتہائی غیر مقبول پالیسیوں سے مکمل طور پر متفق ہیں اور ان کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ مدت ملازمت میں توسیع کے حوالے سے ہونے والی عدالت کی کارروائی کے دوران اس حکومت سے مایوس عوام میں یہ امید پیدا ہوگئی کہ جنرل باجوہ کی مدت ملازمت ختم ہونے جارہی ہے اور ساتھ ہی عمران خان کے اقتدار کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اس کے نتیجے میں ایک زبردست مایوسی پھیل گئی جو کہ حکمرانوں کی خوشی کے بالکل برعکس ہے۔

عوام میں اس حکومت کے حوالے سے پھیلی شدید مایوسی ختم نہیں ہو گی کیونکہ جن وجوہات کی وجہ سے یہ پیدا ہوئی ہے وہ وجوہات اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ آئی ایم ایف کے سامنے پاکستان کی معیشت کو قربان کر دینے اور امریکا کی ہدایت پر بھارت کی

جمہوریت نے انسانوں کو یہ حق دے دیا ہے کہ وہ خود مختار اسمبلیاں بنا کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکامات کو نظر انداز کر دیں۔ یہ اسمبلیاں ایسی سرکردہ شخصیات کے کارخانے ہیں جو استعماری طاقتوں کے خدمت گزار ہیں اور اور ان کی پالیسیوں کو نافذ کرتے ہیں اور اس بات کا مشاہدہ مسلمان خلافت کی تباہی کے بعد کئی دہائیوں سے پوری مسلم دنیا میں کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اسلام کی بطور نظام زندگی بحالی کی جدوجہد میں حزب التحریر کی جدوجہد کا حصہ بنیں کیونکہ یہی وہ واحد مخلص اور باخبر قیادت ہے جو جمہوریت کے خاتمے اور نبوت کے طریقے پر خلافت کی بحالی کی دعوت دے رہی ہے۔

جارحیت اور بدمعاشی کے سامنے "تحمل" کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کا سودا، یہ وہ دو اہم ترین معاملات ہیں جن پر یہ حکومت اپنی روش تبدیل نہیں کرے گی۔ اس طرح موجودہ صورتحال کے حوالے سے عوام کی ناامیدی اور مایوسی میں مزید اضافہ ہو گا۔ یہ مایوسی بڑھ بھی رہی اور پھیل بھی رہی ہے جس کا ثبوت خیبر پختونخوا میں شعبہ صحت، پنجاب میں تجارت اور سندھ میں صفائی کے شعبے سے منسلک افراد کے مسلسل احتجاج اور مظاہرے ہیں۔ لیکن اس صورتحال کے باوجود حقیقی تبدیلی ہمارے ہاتھ سے پھسلتی رہے گی اگر ہم ان شخصیتوں پر آنکھیں بند کیے رکھیں جو ہمیں مایوس کرتی ہیں اور ان پالیسیوں سے نظریں ہٹائے رکھیں جو ہمیں تباہ و برباد کر رہی ہیں۔ جب تک یہ صورتحال برقرار رہے گی خلا بڑھتا رہے گا اور کوئی تعمیری چیز اسے پُر نہیں کر پائے گی۔

حقیقی تبدیلی کے لیے عوام میں پھیلی مایوسی کا رخ اس جانب موڑنے کی ضرورت ہے جو ہماری بدحالی اور ذلت و رسوائی کا حقیقی اور بنیادی سبب ہے۔ اور وہ بنیادی سبب جمہوریت کا نظام ہے۔ جمہوریت نے انسانوں کو یہ حق دے دیا ہے کہ وہ خود مختار اسمبلیاں بنا کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکامات کو نظر انداز کر دیں۔ یہ اسمبلیاں ایسی سرکردہ شخصیات کے کارخانے ہیں جو استعماری طاقتوں کے خدمت گزار ہیں اور اور ان کی پالیسیوں کو نافذ کرتے ہیں اور اس بات کا مشاہدہ مسلمان خلافت کی تباہی کے بعد کئی دہائیوں سے پوری مسلم دنیا میں کر رہے ہیں۔

بقیہ صفحہ 6 پر

تفسیر سورۃ البقرۃ : آیت 196

فقیہ اور مدبر سیاست دان امیر حزب التحریر شیخ عطا بن خلیل ابو رَشتہ کی کتاب **تیسیر فی اصول التفسیر** سے اقتباس:

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ وَ أَتِمُّواْ ٱلۡحَجَّ وَٱلۡعُمۡرَةَ لِلَّهِۚ فَإِنۡ أُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۖ وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ بِهِۦٓ أَذٗى مِّن رَّأۡسِهِۦ فَفِدۡيَةٞ مِّن صِيَامٍ أَوۡ صَدَقَةٍ أَوۡ نُسُكٖۚ فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلۡعُمۡرَةِ إِلَى ٱلۡحَجِّ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۚ فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡۗ تِلۡكَ عَشَرَةٞ كَامِلَةٞۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمۡ يَكُنۡ أَهۡلُهُۥ حَاضِرِي ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ﴾

(البقرۃ: 196)

" اور حج اور عمرہ اللہ تعالیٰ کے لیے پورا پورا ادا کرو، ہاں اگر تمہیں روک دیا جائے تو جو قربانی میسر ہو، (اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرو)۔ اور اپنے سر اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزوں یا صدقے یا قربانی کا فدیہ دے۔ پھر جب تم امن حاصل کر لو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرے کا فائدہ بھی اُٹھائے، وہ جو قربانی میسر ہو (اللہ کے حضور پیش کرے) ہاں اگر کسی کے پاس اس کی طاقت نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات (روزے) اس وقت جب تم (گھروں کو) لوٹ جاؤ۔ اس طرح یہ کل دس روزے ہوں گے۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔" (196)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کریمہ میں مندرجہ ذیل چند باتیں بیان فرمائی ہیں:

1 - جو کوئی حج یا عمرہ کی ادائیگی شروع کرے (یعنی اس کے لیے احرام باندھ لے) تو اس پر اسے مکمل کرنا لازم ہے، یعنی تمام شرائط اور ارکان کے ساتھ اسے پورا کرنا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے: "خذوا عني مناسككم" "مجھ سے حج کے افعال سیکھو" (مسلم: 2286، نسائي: 3012، أبو داوود: 1680، أحمد: 218/3، 366")۔

یہاں آیت میں امر طلب پر دلالت کرتا ہے، نیز یہ طلب حتمی ہے، اس کا قرینہ آیت کا یہ حصہ ہے: **﴿فَإِنۡ أُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِ﴾** "ہاں اگر تمہیں روک دیا جائے تو جو قربانی میسر ہو" چونکہ عدم ادائیگی پر ہَدْی (قربانی) لازم کی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پورا پورا ادا کرنے کی طلب جو لفظ **﴿أَتِمُّواْ﴾** کے ذریعے کی گئی ہے، طلبِ جازم، یعنی حتمی طلب ہے، اس بنا پر جو حج یا عمرہ کو ایک دفعہ شروع کر دے تو اس پر اسے پورا کرنا لازم ہوتا ہے۔

مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہاں احصار (بندش) کی حالت کو مستثنیٰ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ: **﴿فَإِنۡ أُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِ﴾** "ہاں اگر تمہیں روک دیا جائے تو جو قربانی میسر ہو" اور اِحصار لُغت میں بمعنی مطلقاً منع کیے جانے اور روکے جانے کے ہے، مطلقاً یعنی خواہ دشمن کی وجہ سے ہو یا بیماری وغیرہ سے، البتہ آگے اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے **﴿فَإِذَآ أَمِنتُمۡ﴾** ذکر کیا ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں اِحصار دُشمن کی طرف سے روکے جانے کے معنی میں ہے، کیونکہ امن لُغت میں خوف کا متضاد ہے، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ مذکورہ آیت کریمہ حدیبیہ کے سال نازل ہوئی، (جب مشرکین نے آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو مکہ جانے سے روکے رکھا تھا) چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں احصار سے مراد دشمن کی طرف سے رکاوٹ کا موجود ہونا ہے۔

یہ نہیں کہا جائے گا کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا۔ چنانچہ بندش دشمن کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے، اور بیماری وغیرہ کی وجہ سے بھی، تو اس کی دو وجوہات ہیں:

ا- یہ صحیح ہے کہ اعتبار لفظ کے عموم generality کا ہوتا ہے، خاص سبب کا نہیں، مگر عموم اسی موضوع میں ہوتا ہے کہ جس کے متعلق نص وارد ہوئی ہے، اُصول فقہ کے مطابق ایسا ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حُدَیبیہ میں قریش کی طرف سے رسولُ اللہ ﷺ کا احصار اور کسی بھی زمانے میں کسی بھی دشمن کی طرف سے احصار میں اسی عموم کا اعتبار کیا جائے گا۔

ب- یہاں آیت میں بذاتِ خود احصار کے حوالے سے عموم نہیں، کیونکہ **﴿فَإِنۡ أُحۡصِرۡتُمۡ﴾** فعل مثبت Positive verb ہے، اور فعل مثبت میں عموم نہیں ہوتا، ہاں مطلق ہوتا ہے، تو جس موقع کے لیے یہ آیا ہے، یعنی دشمن کی طرف سے بندش، وہاں یہ مطلق

طور پر جاری ہو گا، یعنی دشمن کی طرف سے کسی بھی بندش کی صورت میں، یہی وجہ ہے کہ احصار دشمن کی طرف سے عمرہ یا حج کی تکمیل سے روک جانا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے مرض کے باعث حج کی تکمیل سے روکے جانے کے بارے میں کچھ احادیث آئی ہیں، لیکن وہ احصار کے واقعے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ ترمذیؒ نے حسن اسناد کے ساتھ حجاج بن عمرو سے نقل کیا ہے **(من كسر أو عرج فعليه الحج من قابل)** "جس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے تو اس پر آئندہ سال حج فرض ہے" اسی طرح ضباعہ بنت زبیر بن عبد المطلب سے، جب انہوں نے کہا: یا رسول اللہ ! میں حج کرنا چاہتی ہو مگر میں بیمار ہوں،" آپ ﷺ کا فرمانا "حج کرو اور یہ شرط رکھو کہ میرے حلال ہونے کی جگہ وہی ہے جہاں میں روکی جاؤں۔" یعنی احرام باندھنے والا جب اپنے احرام میں کوئی شرط رکھے پھر اس کو کوئی مرض درپیش ہو جائے، تو اس کے لیے احرام کھولنا جائز ہو گا، اور جو ذمہ داری دشمن کی وجہ سے حج مکمل نہ کرنے والے پر آتی ہے، وہ اس پر نہیں۔

یہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بیماری کے باعث حج کی تکمیل سے رہ جانا احصار نہیں کہلاتا، نہ اس پر احصار کے احکام لاگو ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر حاجی کسی بیماری کے سبب حج مکمل نہ کر پائے، تو وہ وہیں احرام کھول دے جہاں اسے رکنا پڑا ہے، اور آئندہ سال حج کرے، اس میں احصار کی طرح قربانی نہیں۔

اس بنا پر احصار دشمن کی وجہ سے ہوتا ہے، کسی اور وجہ سے نہیں۔2 –جب احصار (بندش) ہو جائے تو قربانی کرنے سے پہلے احرام کھولنا جائز نہیں۔ اور قربانی جو اس کو میسر ہو، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے: ﴿فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِ﴾ "پس جو قربانی تمہیں میسر ہو۔" کیونکہ اِسْتَيسَرَ اور تَيَسَّرَ ہم معنی ہیں۔ اور ﴿ٱلۡهَدۡيِ﴾ مصدر ہے، اور اس کے معنی مفعول کے ہیں، یعنی وہ جانور جس کی قربانی کی جاتی ہے۔ اونٹنی ہو یا گائے اور بکری جو بھی حاجی کے لیے میسر ہو۔ بڑی قربانی میں اور زیادہ فضیلت ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔

اور احرام کھولنے سے پہلے ذبح کا واجب ہونا اللہ تعالیٰ کے اس قول سے لیا جاتا ہے :﴿**وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥ**﴾ "اور اپنے سر اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔" سر منڈانا احرام کھولنے سے کنایہ ہے، یعنی حاجی جس نے احرام باندھا ہوا ہے، احصار کی صورت میں اس پر احرام کھولنے سے پہلے قربانی ذبح کرنا لازم ہے، جو اس کو میسر ہو۔ اس بات کا قرینہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنا احرام کھولنے سے پہلے واجب ہے، اس کا قرینہ سنت ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان مسلمانوں کے بارے میں جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر ذبح کرنے میں پس و پیش کا مظاہرہ کیا تھا، فرمایا تھا" ہلاک ہوئے۔" یہ ایسا وصف مفہم ہے جو احرام کھولنے سے پہلے قربانی ذبح کرنے کی طلب کو طلبِ جازم بتلاتا ہے۔

قربانی ذبح کرنے کی جگہ حرم ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اخذ ہوتا ہے:﴿**وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥ**﴾ "اور اپنے سر اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔" اور اپنی جگہ حرم کو کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿**ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمۡ شَعَٰٓئِرَ ٱللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقۡوَى ٱلۡقُلُوبِ (٣٢) لَكُمۡ فِيهَا مَنَٰفِعُ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى ثُمَّ مَحِلُّهَآ إِلَى ٱلۡبَيۡتِ ٱلۡعَتِيقِ (٣٣)**﴾ (الحج/32-33.)"یہ ساری باتیں یاد رکھو، اور جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو یہ بات دلوں کے تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ تمہیں ایک معین وقت تک ان (جانوروں) سے فوائد حاصل کرنے کا حق ہے، پھر ان کے حلال ہونے کی جگہ اُسی قدیم گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے آس پاس ہے۔" قدیم گھر کعبہ شریف ہے، یہاں اس سے مجازاً پورا حرم مراد ہے، جزء کا اطلاق کل پر کیا گیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿**سُبۡحَٰنَ ٱلَّذِيٓ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ لَيۡلٗا مِّنَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ إِلَى ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡأَقۡصَا ٱلَّذِي بَٰرَكۡنَا حَوۡلَهُۥ**﴾"(الإسراء:1)" پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، جس کے ماحول میں ہم نے برکتیں نازل کی ہیں۔"اس آیت میں مسجد حرام کا اطلاق مجازاً حرم پر کیا ہے، یہ بھی جزو کے کُل پر اطلاق کے قبیل سے ہے، اور مراد پورا حرم ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو حرم سے لے جایا گیا تھا مسجد حرام کے اندر سے نہیں، اور قدیم گھر سے بھی یہاں اسی طرح مجازاً پورا حرم مراد ہے۔ یعنی یہاں بھی جزو بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔

اس بات کی تائید کہ حرم سارا کا سارا قربان گاہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے قول سے بھی ہوتی ہے،" میں نے یہاں قربانی کی ہے اور سارا منیٰ قربان گاہ ہے سو تم اپنی اپنی جگہوں میں ذبح کرو۔" مکہ کے سب راستے طریق اور قربان گاہ ہیں۔" (ابو داؤد، حاکم) لیکن یہاں حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کا ہدی لے کر جانا اور وہیں

ذبح کرنے کا سوال ہو سکتا ہے، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حدیبیہ زمین حل میں حدود حرم پر واقع علاقہ ہے، یعنی حرم سے باہر ہے۔ (تو گویا حرم میں ذبح کرنا لازم نہیں) اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے:

1 – کفار قریش نے اُس سال رسول اللہ ﷺ کو قربانی سمیت عمرہ سے روکا تھا، ان کو حدیبیہ میں قربانیاں کرنی پڑیں، کیونکہ دشمن نے ان کو بھی روکا اور ان کی قربانیوں کو بھی حرم میں پہنچنے سے روک دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے: ﴿**هُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَصَدُّوكُمۡ عَنِ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ وَٱلۡهَدۡيَ مَعۡكُوفًا أَن يَبۡلُغَ مَحِلَّهُۥ**﴾ (الفتح:25)" یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا، اور تمہیں مسجد حرام سے روکا، اور قربانی کے جانوروں کو جو ٹھہرے ہوئے کھڑے تھے، اپنی جگہ پہنچنے سے روک دیا۔" یعنی قربانیاں قربان گاہ میں پہنچنے سے روک کر ذبح کی جگہ نہیں پہنچنے دیا گیا تاکہ وہاں ذبح کر دی جاتیں، یعنی رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں، جہاں آپ کو روکا گیا، وہیں قربانیوں کو ذبح کیا، کیونکہ دشمنوں کی طرف سے رکاوٹ کی وجہ سے قربانیاں حرم نہیں پہنچ سکتی تھیں جو ان کو ذبح کرنے کی جگہ ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جانور ذبح کرنے کا مقام حرم ہے، سوائے اس کے کہ دشمن رکاوٹ ڈالے، اس صورت میں جہاں روکا جائے، وہیں ذبح کیا جائے گا۔

ب–جیسا کہ سیرۃ ابنِ ہشام میں ابنِ اسحاق سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر یعنی خیمے حل میں نصب کیے گئے تھے، آپ نماز پڑھنے کے لیے زمینِ حرم میں تشریف لے جاتے تھے، کیونکہ حدیبیہ حل اور حرم کی عین سرحد پر واقع ہے۔ اسی طرح زُہری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حرم میں قربانی کی، بالخصوص رسول اللہ ﷺ حدیبیہ میں ہوتے ہوئے نمازیں حرم میں پڑھتے تھے، یعنی حل سے حرم میں جاکر نماز پڑھ آتے تھے، اس حالت میں یقیناً رسول اللہ ﷺ نے حرم میں ہی ذبح کیا ہو گا، کیونکہ جگہ بالکل ہی قریب اور متصل تھی، چنانچہ حرم کے اندر ذبح کرنا آسان تھا۔

اس بنا پر جانوروں کی قربانی حرم میں کی گئی، اور آیت میں ﴿ **وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥ**﴾" اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔" اپنی جگہ سے مراد حرم ہے۔

4 – ﴿**فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ بِهِۦٓ أَذٗى مِّن رَّأۡسِهِۦ فَفِدۡيَةٞ مِّن صِيَامٍ أَوۡ صَدَقَةٍ أَوۡ نُسُكٖ**﴾

کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: بے شک نبی ﷺ میرے پاس سے گذرے جبکہ میں حدیبیہ میں تھا، میں احرام کی حالت میں تھا اور ابھی مکہ میں داخل نہیں ہوا تھا، میں ہانڈی کے نیچے آگ سلگا رہا تھا، اور جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں، تو آپ ﷺ نے مجھے کہا: ان کیڑوں سے تکلیف ہوتی ہے؟ میں نے عرض کی: ہاں! تو فرمایا: اپنا سر منڈاؤ اور چھ مسکینوں کو ایک فرق کھانا کھلاؤ، فرق تین صاع ہوتے ہیں۔ یا تین دن روزے رکھو، یا پھر ایک قربانی کرو۔" یعنی کوئی بکری ذبح کرو۔ بخاریؒ کی روایت میں ہے((**أن رسول الله ﷺ قال له: ما كنت أرى أن الجهد بلّد بك هذا أما نجد شاة؟ فقال: لا. قال: صم ثلاثة أيام أو أطعم ستة مساكين لكل مسكين نصف صاع من طعام واحلق رأسك**)) " رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: مجھے نہیں پتہ تھا کہ تکلیف اور مشقت کی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہوئی ہو گی، کوئی بکری ہے آپ کے پاس؟ میں نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تین دن روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، ہر مسکین کے لیے آدھا صاع کھانا، پھر سر منڈاؤ۔"

تو جیسے آیت اور حدیث نے بتایا ہے، کوئی بیمار ہو یا سر میں زخم، جوئیں یا درد وغیرہ ہونے کی وجہ سے تکلیف میں مبتلاء ہو، تو اِن جیسے اُمور کی وجہ سے ﴿**لَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ**﴾"اپنے سر نہ منڈاؤ۔" میں اس کے لیے تخصیص ہو جاتی ہے، یعنی ایسے آدمی کے لیے سر مُنڈانا اور فدیہ دینا جائز ہے، جو اختیاری طور پر تین دن کے روزے رکھنے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانا یا بکری کی قربانی ہے، جو اس کو میسر ہو۔ اور یہاں کئی چیزوں کے درمیان اختیار دینا وجوب کا قرینہ ہے، جیسا کہ اُصول فقہ میں ہے۔

5 – پھر اللہ تعالیٰ امن کے ساتھ یعنی بغیر احصار کے حجِ تمتع کرنے والے کے لیے حکم شرعی بیان فرماتا ہے، تمتع یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص حج کے مہینوں میں میقات سے عمرہ کا احرام باندھ لے، پھر عمرہ ادا کرے، عمرہ کی ادائیگی کے بعد وہ احرام کھول کر یومِ تَرْوِیَہ تک انتظار کرتا رہے، ذی الحجہ کا آٹھواں دن یومِ تَرْوِیَہ کہلاتا ہے۔ پھر وہ مکہ سے حج کے لیے احرام باندھتا ہے، اور مناسک حج ادا کرتا ہے۔ اس شخص کو مُتَمتِع کہا جاتا ہے، اس کے لیے حکم شرعی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ متعہ کی سہولت دیے جانے کی قربانی کرے، جو اس کو میسر ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول

﴿فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلۡعُمۡرَةِ إِلَى ٱلۡحَجِّ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِ﴾سے یہی مراد ہے،یعنی "پھر جب تم امن حاصل کرلو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرے کا فائدہ بھی اُٹھائے، تو وہ جو قربانی میسر ہو(اللہ کے حضور پیش کرے)۔اگر کسی کے پاس اس کی طاقت نہ ہو کہ وہ حج کے دنوں میں قربانی ذبح کر دے تو اس پر لازم ہے کہ وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے۔مثلاً وہ ذی الحجہ کے ساتویں، آٹھویں اور نویں کو روزے رکھے، یا ایام التشریق میں رکھے، جیسا کہ امام بخاری اور محدثین کی ایک جماعت نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں:" آپ ﷺ نے ایامِ تشریق میں روزے کی اجازت کسی کو نہیں دی، سوائے اس متمتع حاجی کے جس کے بس میں قربانی نہ ہو۔"

امام مالک نے زُھری سے حدیث روایت کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن حذافہ کو بھیجا، انہوں نے ایامِ تشریق(عید کے بعد والے دن) میں اعلان کرکے کہا: یہ کھانے پینے اور ذکر الٰہی کے دن ہیں ، سوائے اس شخص کے جس پر قربانی کے روزے باقی ہوں"، پھر جب وہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر آئے تب سات دن مزید روزے رکھے گا جس کا مجموعہ دس دن کامل بنتے ہیں(تفسیر طبری 2/250)۔ امام بخاری کی روایت میں یہی آیا ہے ، اس آیت ﴿وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡ﴾کی تفسیر میں بخاری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جب تم اپنے شہروں میں واپس چلے جاؤ(طبری نے اسے اپنی تفسیر میں بیان کیا اور بخاری نے اپنی صحیح میں اس کی تخریج نہیں کی ہے) یہ تمام تر تفصیلات آیت کے اس حصے کے مطابق ہیں جس میں آیا ہے کہ﴿فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡۗ تِلۡكَ عَشَرَةٞ كَامِلَةٞ﴾" ہاں اگر کسی کے پاس اس کی طاقت نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات (روزے) اس وقت جب تم (گھروں کو) لوٹ جاؤ۔ اس طرح یہ کل دس روزے ہوں گے، یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں "۔اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا قول﴿تِلۡكَ عَشَرَةٞ كَامِلَةٞ﴾التباس (کنفیوژن)کے ازالہ کے لیے ہیں، التباس اللہ سبحانہ کے اس قول ﴿فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡ﴾ سے پیدا ہو سکتا ہے، جس کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ تین دن کے روزے حج میں یا سات روزے گھر واپسی آنے پر رکھو۔ کیونکہ واوٗ(اور) کا ایک معنی اَوٗ(یا) بھی آتا ہے، تو جب کہا جائے جالس زيداً و عُمَراً " زید و عمر کے پاس بیٹھو"اس صورت میں آپ دونوں کے ساتھ بیٹھ جائیں یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ، تو یہ اس حکم پر عمل سمجھا جائے گا،(لیکن آیت میں تین اور سات روزوں کے درمیان اختیار کی بات نہیں) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول ﴿تِلۡكَ عَشَرَةٞ كَامِلَةٞ﴾ سے آیت کے اس پچھلے حصے کا مقصد بیان کیا ہے،یعنی یہ کہ ﴿ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡۗ﴾سے پورے دس دن مراد ہیں۔

یہ حکم اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ ہو، اگر وہ وہیں ہوں تو پھر معاملہ مختلف ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے،﴿ذَٰلِكَ لِمَن لَّمۡ يَكُنۡ أَهۡلُهُۥ حَاضِرِي ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ﴾ "یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں"۔

﴿ذَٰلِكَ﴾اشارہ کے لیے ہے اور اس سے﴿فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلۡعُمۡرَةِ إِلَى ٱلۡحَجِّ﴾ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ،یا ﴿فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡ﴾کی طرف، البتہ یہ ہے کہ﴿ذَٰلِكَ﴾ کے بعد ﴿مَن﴾ سے پہلے لام لگایا گیا ہے ،جس کی وجہ سے ترجیح اس کو ہے کہ﴿ذَٰلِكَ﴾سے اشارہ﴿فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلۡعُمۡرَةِ إِلَى ٱلۡحَجِّ﴾کی طرف ہو۔ کیونکہ اگر یہ اشارہ روزوں کی طرف ہو تا جو قربانی نہ پانے کی صورت میں متمتع پر واجب ہوتے ہیں، تو لام کے بجائے (علیٰ) لگتا،یعنی آیت ایسی ہوتی کہ (ذلك علىٰ من لم يكن أهله حاضري المسجد الحرام) کیونکہ لهم اور عليهم میں فرق ہے، تو لِمَنْ کے مناسب یہ ہے کہ حج تمتع کرنے یا نہ کرنے میں اختیار دیا جائے۔ (کیونکہ لِمَنْ کی صورت میں معنی یہ بنتے ہیں کہ: یہ اس کے لیے ہے جس۔۔۔۔) اور عَلَيهِمْ کی مناسبت اس بات سے ہے کہ جہاں کسی ذمہ داری کی عدم ادائیگی کے نتیجے میں کوئی کام کرنا پڑے۔ اب معنی یہ ہوں گے کہ جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس ہوں، تو اُن کے لیے حج تمتع کرنا جائز نہیں۔یعنی ان کے لیے جائز نہیں کہ وہ حج کے مہینوں میں پہلے عمرہ کا احرام باندھ لیں اور عمرہ مکمل کرنے پر احرام کھول دیں، پھر اس کے بعد حج کے لیے دوبارہ احرام باندھ لیں، بلکہ جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس ہوں تو یا تو وہ اجح کے مہینے میں حج قِران کا احرام باندھ لیں، یا حج مفرد کریں ۔حج قِران اس طرح ہوتا ہے کہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد احرام نہ کھولیں، بلکہ برابر اسی احرام کے ساتھ حج کے افعال ادا

کرنا شروع کریں، پھر حج مکمل کرنے پر کھول دیں،(گویا حج قران میں عمرہ اور حج کو ایک ہی احرام میں اکٹھا کر کے ادا کرسکتے ہیں) اور حج مفرد یعنی عمرہ کے بغیر حج۔ اگر وہ فقط عمرہ کرنا چاہیں تو حج کے مہینے کے علاوہ مہینوں میں جتنے چاہیں عمرے ادا کرسکتے ہیں۔

6 – مسجد حرام کے پاس رہنے والے کون ہیں؟ تو حاضر کے معنی مقیم کے ہیں، آیت میں حاضر کی نسبت مسجد حرام کی طرف کی گئی ہے، یعنی مسجد حرام کے مقیم، مگر جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کبھی مسجد حرام بول کر زمین حرم مراد لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا قول ہے﴿سُبۡحَـٰنَ ٱلَّذِىٓ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ لَيۡلاً مِّنَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ إِلَى ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡأَقۡصَا ٱلَّذِى بَـٰرَكۡنَا حَوۡلَهُ ۥ﴾ (الاسراء:1) پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، جس کے ماحول میں ہم نے برکتیں نازل کی ہیں۔" حالانکہ رسول اللہ ﷺ کو حرم سے لے جایا گیا تھا، مسجد حرام سے نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿حَاضِرِى ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ﴾ کی تفسیر میں یہی کہا ہے، یعنی اہل حرم۔

اہل کے حاضر ہونے کا مطلب خود حاجی کا وہاں ہونا ہے ، لیکن یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ غالباً آدمی اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہی رہتا ہے۔

اس لیے اب معنی یہ ہوں گے کہ: غیر اہل حرم میں سے جو حج تمتع ادا کرے، کیونکہ اہل حرم حج تمتع نہیں کرسکتے، تو اُس پر واجب ہے کہ وہ ایک قربانی کرے، اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن حج کے دنوں میں روزے رکھے گا اور اپنے گھر آکر سات دن مزید روزے رکھے گا۔

آخر میں آیت کے اختتام میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ تقویٰ کا حکم دیتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا ہر امر اسی نہج پر بجالایا جائے جیسے اس نے حکم دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ہر نہی سے اسی طرح پرہیز کیا جائے جیسے کہ نہی کی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں اسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور اس کے عذاب سے نجات پائے گا، ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے، آگے یہی فرمایا ہے: ﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ﴾

" اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ اپنے عذاب میں شدید ہے"۔

ختم شد

بقیہ صفحہ 1 سے

جب تک ہم جمہوریت کا خاتمہ کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی وحی کی بنیاد پر حکمرانی کو بحال نہیں کرتے ہم مایوسی کی کیفیت اور ناانصافی کے ماحول میں زندگی گزارتے رہیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ اسلام کی بطور نظام زندگی بحالی کی جدوجہد میں حزب التحریر کی جدوجہد کا حصہ بنیں کیونکہ یہی وہ واحد مخلص اور باخبر قیادت ہے جو جمہوریت کے خاتمے اور نبوت کے طریقے پر خلافت کی بحالی کی دعوت دے رہی ہے۔ صرف خلافت کی بحالی کے بعد ہی ہمیں وہ دور نصیب ہوگا جس میں ایسی قیادت ہوگی جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے ہمیں متحرک کرے گی، اور ایسی پالیسیاں نافذ کرے گی جو ہمیں مضبوط بنائیں گی۔

حزب التحریر کے مرکزی میڈیا آفس کے لیے لکھا گیا

ختم شد

بقیہ صفحہ 47 سے

یہ وقت کی ضرورت ہے کہ آپ خلافت کے قیام کے لیے حزب التحریر کے ساتھ مل کر زبردست جدوجہد کریں۔ ریاست خلافت مسلمانوں کے علاقوں کو یکجا کر کے اس کی طاقتور افواج کو بھارت فتح کرنے کے لیے حرکت میں لائے گی۔ تب پھر آپ ہندو ریاست کی شکست اور ذلت و رسوائی اور رسول اللہ ﷺ کی غزوہ ہند سے متعلق بشارت کو پورا ہوتے دیکھیں گے۔ ان شاءاللہ۔

ابو ہریرہؓ نے فرمایا، **عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: وَعَدَنَا رَسُولُ اللهِ صلىٰ الله عليه وآله وسلم فِي غَزْوَةِ الْهِنْدِ، فَإِنْ اسْتُشْهِدْتُ كُنْتُ مِنْ خَيْرِ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ رَجَعْتُ فَأَنَا أَبُوهُرَيْرَةَ الْمُحَرَّرُ.** " حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے غزوہ ہند کے بارے میں وعدہ فرمایا تھا، اگر میں اس میں شہید ہو گیا تو بہترین شہیدوں میں سے ہوں گا۔ اور اگر واپس آ گیا تو میں وہی ابو ہریرہ ہوں گا لیکن (گناہوں سے) آزاد "(النسائی)۔

ولایہ بنگلادیش میں حزب التحریر کا میڈیا آفس`

ختم شد

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کے لیے صالح لوگوں کی دوستی اور صحبت اختیار کرنا

تحریر: مصعب عمیر، پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی وحی کی بنیاد پر حکمرانی کی غیر موجودگی کی وجہ سے دوستی اور لوگوں کی صحبت اختیار کرنا، اپنے اندازاور اہمیت دونوں لحاظ سے کم ہو چکا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تعلقات متوقع مادی فوائد کی بنیاد پر تعمیر کیے جاتے ہیں، چاہے یہ فوائد مال و دولت سے متعلق ہوں یا دنیاوی اثر و رسوخ سے یا معاشرے میں بلند مقام سے ۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے کے لیے اُس وقت تک ملتے جلتے اور اکٹھے وقت گزارتے ہیں جب تک ایک دوسرے سے مادی فوائد ملتے رہیں اور جیسے ہی ان فوائد کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے ویسے ہی ملنا جلنا بند اور تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کے ساتھ جو وقت گزارا جاتا ہے اس کا مقصد دنیاوی فوائد کو سمیٹنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنا ہوتا ہے جس سے مال کی محبت مزید بھڑکتی ہے۔ آخرت کی فکر اور تیاری کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ صحبت دنیاوی حصول کے گرد اس طرح گھومتی ہے جیسا کہ یہی سب کچھ ہے۔ دنیاوی فوائد کے حصول کے لیے بنائے گئے رشتے اور دوستیاں معاشرے کو پستی پر برقرار رکھتے ہیں اور یہ اسلام کی بنیاد پر استوار اعلیٰ معاشرتی معیار سے کوسوں دور ہے۔

یقیناً روز آخرت جب ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو نافرمانی، گمراہی اور گناہ کی بنیاد پر قائم کی گئی دوستیاں ہمارے لیے انتہائی شرمندگی اور افسوس کا باعث ہوں گی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا،

يَوَيْلَتَا لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ۔ لَّقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا "ہائے شامت! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے نصیحت (کتاب) کے میرے پاس آنے کے بعد مجھے اس سے بہکا دیا۔ اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے "(الفرقان، 29-25:28)۔ یعنی وہ شخص اپنے دوست کو سچی ہدایت سے موڑ کر گمراہی کے راستے پر چلنے کی طرف رہنمائی کی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انسانیت کو خبردار کیا ہے کہ، **الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ** "(جو آپس میں) دوست (ہیں) اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ مگر پرہیزگار (کہ باہم دوست ہی رہیں گے)"(الزخرف 43:67)۔ یقیناً شیطان اور گناہگار کی دوستی اور صحبت کا پھل سب سے کڑوا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ وقت گزارنے سے انسان کا نفس آلودہ ہی ہوتا ہے۔ ایک حامل دعوت جو ایسے شخص کو ہدایت کے رستے پر لانے کے لیے اس کے ساتھ وقت گزارتا ہے اسے بھی اس پہلو سے خبردار رہنا چاہیے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تعلقات متوقع مادی فوائد کی بنیاد پر تعمیر کیے جاتے ہیں، چاہے یہ فوائد مال و دولت سے متعلق ہوں یا دنیاوی اثر و رسوخ سے یا معاشرے میں بلند مقام سے۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے کے لیے اُس وقت تک ملتے جلتے اور اکٹھے وقت گزارتے ہیں جب تک ایک دوسرے سے مادی فوائد ملتے رہیں اور جیسے ہی ان فوائد کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے ویسے ہی ملنا جلنا بند اور تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کے ساتھ جو وقت گزارا جاتا ہے اس کا مقصد دنیاوی فوائد کو سمیٹنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنا ہوتا ہے جس سے مال کی محبت مزید بھڑکتی ہے۔ آخرت کی فکر اور تیاری کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ صحبت دنیاوی حصول کے گرد اس طرح گھومتی ہے جیسا کہ یہی سب کچھ ہے۔

نبی آخر الزمان محمد ﷺ کو ان کے رب سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا تھا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو اور ان لوگوں کی صحبت سے خبردار کیا جو دنیا کی چمک دمک اور نمود و نمائش کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا، **وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا**"اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر صبر کرتے رہیں۔ اور آپ کی نگاہیں ان میں (گزر کر کسی

اور طرف) نہ دوڑیں کہ آپ آرائشِ دنیا کے خواستگار ہو جائیں۔ اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہا کبھی نہ ماننا"(الکھف 18:28)۔ اس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی صحبت اختیار کریں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، جو اس (اللہ) کے واحد و لاشریک ہونے کی گواہی دیتے ہیں، جو اس (اللہ) کی تعریف کرتے ہیں، جو اس (اللہ) کی شان و عظمت بیان کرتے ہیں، جو اس (اللہ) کی بڑائی بیان کرتے ہیں اور دن رات صرف اس (اللہ) ہی کو پکارتے ہیں: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مخلص خدمتگار چاہے وہ امیر ہوں یا غریب، کمزور ہوں یا طاقتور۔ اس آیت کے متعلق امام مسلم نے اپنی صحیح میں بیان کیا کہ سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا، **كنا مع النبي ﷺ ستة نفر ، فقال المشركون للنبي ﷺ : اطرد هؤلاء لا يجترئون علينا! . قال : وكنت أنا وابن مسعود ، ورجل من هذيل ، وبلال ورجلان نسيت اسميهما فوقع في نفس رسول الله ﷺ ما شاء الله أن يقع ، فحدث نفسه ، فأنزل الله عز وجل : (ولا تطرد الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه**"پیغمبر ﷺ کے ساتھ ہم چھ لوگوں کا گروہ موجود تھا۔ بت پرستوں نے محمد ﷺ سے کہا،'ان لوگوں سے کہو کہ یہاں سے چلے جائیں تاکہ ان کی وجہ سے ہمیں غصہ نہ آئے'۔ وہاں میں، ابن مسعود، ھذیل کا ایک آدمی، بلال اور دو مزید لوگ تھے جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ آپ ﷺ کے دل میں جو اللہ نے چاہا وہ آیا۔ آپ ﷺ نے دل ہی دل میں باتیں کیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:«**وَلاَ تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ**» 'مت ہٹائیں ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام اور چاہتے ہیں اس کی رضامندی'(الأنعام: 52)" ۔ یعنی دنیا کے پیچھے بھاگنے والے قریش نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ان کمزور لیکن نیک صحابہ :بلالؓ، عمارؓ، خبابؓ اور ابنِ مسعودؓ، کو خود سے دور کر دیں تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ

> وہ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے واقعی پُرجوش ہیں اور جنت کی عظیم نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ صالح لوگوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ صحبت اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **الرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ** "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے "(ابو داؤد، ترمذی)۔

نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

جہاں تک اس آیت:﴿**وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا**﴾"اور تمہاری نگاہیں ان میں (گزر کر کسی اور طرف) نہ دوڑیں کہ تم آرائشِ زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ "کا تعلق ہے تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ،**ولا تجاوزهم إلى غيرهم: يعني: تطلب بدلهم أصحاب الشرف والثروة** "دوسروں کو ان پر ترجیح مت دو یعنی دولت مند اور اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھنے والوں کو ان (نیک) لوگوں پر ترجیح مت دو"۔ لہٰذا اہل قوت اور اثر ورسوخ رکھنے والے لوگوں میں سے مخلص افراد کو اپنے درمیان موجود ایسے کرپٹ لوگوں سے خبردار رہنا چاہیے۔ انہیں ان لوگوں سے ملتے ہوئے ہوشیار رہنا چاہیے جو دولت اور رتبے کا لالچ دے کر انہیں آگ کے طرف بلائیں گے۔ انہیں قریش کی شرمناک مثال کی پیروی کبھی نہیں کرنی چاہئے جنہوں نے اُن نیک صحابہ کو ذلیل سمجھا جو اُنہیں سچائی کی راہ دیکھانا چاہتے تھے، کیونکہ وہ رتبے اور دولت کے لحاظ سے کمتر تھے، حالانکہ یہ صالح آخرت میں نیکی اور رتبے کی بلندیوں پر ہوں گے۔

وہ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے واقعی پُرجوش ہیں اور جنت کی عظیم نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ، وہ صالح لوگوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ صحبت اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **الرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ** " آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے تم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے "(ابو داؤد، ترمذی)۔ ایک ایسے دور میں جب لوگ اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں، یہ لوگ اپنے گھر والوں اور اپنے کام سے کچھ وقت نکال کر ان لوگوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں جن کے ساتھ ان کا محبت کا تعلق صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وجہ سے ہے، کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ محبت جنت میں ان کے درجات کو بڑھا دے گی۔ بزار نے حسن اسناد کے ساتھ عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا، **مَنْ أَحَبَّ رَجُلا لِلَّهِ ، فَقَالَ إِنِّي أُحِبُّكَ لِلَّهِ ، فَدَخَلا الْجَنَّةَ ، فَكَانَ الَّذِي أَحَبَّ أَرْفَعُ مَنْزِلَةً مِنَ الآخَرِ،الْحَقُّ بِالَّذِي أَحَبَّ لِلَّهِ** "جو بھی کسی شخص سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہے اور کہتا ہے: میں تم سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں، اور پھر انہیں جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے، تو وہ جس سے محبت کرتا تھا اگر اس کا درجہ اِس سے بلند ہو گا تو اِس کو بھی اُس شخص کے ساتھ ملا دیا جائے گا جس سے وہ محبت کرتا تھا"۔

آج کے سرمایہ دارانہ انفرادیت پسندی کے دور میں وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی صحبت حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں آپس کی ملاقات میں ایک دوسرے کو اس بات کی یاددہانی کرانی چاہیے کہ ہمیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت میں اضافے کی ضرورت ہے۔ ربیع بن کعب نے بیان کیا، "ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا اور ان کے لیے پانی لایا، جو انہوں نے منگوایا تھا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا، **سَلْ** "پوچھو (جو بھی پوچھنا چاہتے ہو)"۔ میں نے کہا، **أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ** "میں جنت میں آپ کا ساتھ چاہتا ہوں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا، **أَوَغَيْرَ ذَلِكَ** "اس کے علاوہ بھی کچھ چاہتے ہو"۔ میں نے کہا، **هُوَ ذَاكَ** "بس یہی چاہتا ہوں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا، **أَعِنِّي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ** "تو عبادات اور سجدوں میں اضافے کے ذریعے اپنے اس مقصد کے حصول میں میری مدد کرو" (مسلم)۔ وہ لوگ جن کی نگاہیں آخرت پر جمی ہیں انہیں چاہیے کہ وہ نیک لوگوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ ابو سعید خذریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **لا تُصَاحِبْ إِلَّا مُؤْمِنًا، وَلا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ** "صرف ایمان والوں کو اپنا دوست بناؤ اور صرف نیک آدمی ہی تمہارا کھانا کھائے" (ترمذی، ابو داؤد)۔ آج کے سرمایہ دارانہ دور میں جب صرف کاروبار اور تجارتی مفاد کے لیے ہی وقت نکالا جاتا ہے، تو ہمیں چاہیے کہ ہم بہترین تجارت کے حصول میں اپنا وقت لگائیں، آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتوں کے

ابو سعید خذریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **لا تُصَاحِبْ إِلَّا مُؤْمِنًا، وَلا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ** "صرف ایمان والوں کو اپنا دوست بناؤ اور صرف نیک آدمی ہی تمہارا کھانا کھائے" (ترمذی، ابو داؤد)۔ آج کے سرمایہ دارانہ دور میں جب صرف کاروبار اور تجارتی مفاد کے لیے ہی وقت نکالا جاتا ہے، تو ہمیں چاہیے کہ ہم بہترین تجارت کے حصول میں اپنا وقت لگائیں، آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتوں کے حصول کی تجارت۔

حصول کی تجارت۔ عبد اللہ بن عمروؓ نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **خَيْرُ الأَصْحَابِ عِنْدَ اللَّهِ خَيْرُهُمْ لِصَاحِبِهِ وَخَيْرُ الْجِيرَانِ عِنْدَ اللَّهِ خَيْرُهُمْ لِجَارِهِ** " اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساتھیوں میں سے بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو، اور اللہ کے نزدیک پڑوسیوں میں سے بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو" (ترمذی)۔ نیک لوگوں کے ساتھ تھوڑے سے وقت کے لیے صحبت کو بھی ہمیں معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

قتادہ نے حدیث روایت کی: میں نے انسؓ سے پوچھا، **أَكَانَتِ الْمُصَافَحَةُ فِي أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ** "کیا صحابہ میں ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ ملانے کا رواج تھا؟"، انہوں نے کہا، "ہاں" (بخاری)۔ ہمیں چاہیے کہ جو وقت ہم اچھے لوگوں کی صحبت میں گزارتے ہیں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اس بات پر توجہ دیں کہ کوئی بھی اس سے محروم نہ رہے۔ عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **إِذَا كُنْتُمْ ثَلاَثَةً فَلاَ يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُونَ صَاحِبِهِمَا فَإِنَّ ذَلِكَ يُحْزِنُهُ** " جب تم تین آدمی ایک ساتھ ہو، تو دو آدمی اپنے تیسرے ساتھی کو اکیلا چھوڑ کر سرگوشی نہ کریں کیونکہ اس سے اسے دکھ اور رنج ہو گا" (ابن ماجہ)۔ ایک ایسے دور میں جب لوگوں کے پاس ایک دوسرے سے ملنے کے لیے وقت نہیں ہے اور وہ اپنی تسکین کے لیے صرف سوشل میڈیا پر پیغامات کا تبادلہ کر رہتے ہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خاطر لوگوں سے براہِ راست روابط بنائیں۔

صحابہؓ کی اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے دوستی اور صحبت نے انہیں وہ بلندی عطا کی کہ وہ آنے والی تمام نسلوں میں سب سے بہترین کہلوائے گئے۔ صرف نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ کی عادات کا بغور جائزہ لینا اور ان پر عمل کرنا ہی کافی ہے کیونکہ یہ وہ گروہ ہے جس کے ایمان اور صبر واطاعت کی وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سے اپنی رضامندی کا اظہار قرآن میں فرمایا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا، **وَالسَّـٰبِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَـٰجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ** " جن لوگوں نے سبقت کی یعنی مہاجرین اور انصار۔ اور جنہوں نے اچھے طور پر ان کی

پیروی کی اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں"(التوبہ 9:100)۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ مہاجرین و انصار سے راضی ہے اور ان سے بھی جنہوں نے ان کی احسن انداز میں پیروی کی ، اور یہ کہ وہ اللہ سے راضی ہیں اوراللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کا لطف کبھی ختم نہ ہوا۔

یقیناً یہ اسلام کی بنیاد پر دوستی ہی ہے جو امت کی سب سے بہترین نسل تیار کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کی۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد یہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ ہی تھے جنہوں نے نبوت کے نقشِ قدم پر پہلی خلافت راشدہ قائم کی۔ وہ لوگ جو دوسری بار نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کی دوستی میں کئی عظیم سبق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **تَكُونُ النُّبُوَّةُ فِيكُمْ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا عَاضًّا فَيَكُونُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ** " جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تمہارے درمیان نبوت موجود رہے گی پھر اللہ اسے اٹھانا چاہئے گا تو اٹھالے گا پھر طریقہ نبوت پر گامزن خلافت ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر جب اللہ اسے اٹھانا چاہے گا تو اٹھالے گا ، پھر موروثی حکومت ہو گی اور وہ بھی اس وقت رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا پھر جب اللہ اسے اٹھانا چاہے گا تو اٹھالے گا پھر طریقہ نبوت پر گامزن خلافت آجائے گی پھر نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے "(احمد)۔

اس دور میں کہ جب کوئی نبی نہیں آئے گا، ہمیں یہ یاد رکھنا ہے کہ روز آخرت انبیاء ان لوگوں کو ستائش کی نگاہ سے دیکھیں گے جنہوں نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خاطر ایک دوسرے سے دوستی کی تھی۔ حاکم نے اپنی مستدرک میں ابن عمرؓ سے روایت کیا اور کہا یہ روایت درست ہے اگرچہ اسے بخاری و مسلم نے اسے روایت نہیں کیا، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،**إن لله عباداً ليسوا بأنبياء ولا شهداء يغبطهم الشهداء والنبيون يوم القيامة لقربهم من الله تعالى ومجلسهم منه، فجثا أعرابي على ركبتيه فقال يا رسول الله صفهم لنا وحلّهم لنا قال: قوم من أفناء الناس من نزاع القبائل، تصادقوا في الله وتحابوا فيه، يضع الله عز وجل لهم يوم القيامة منابر من نور، يخاف الناس ولا يخافون، هم أولياء الله عز وجل الذين لا خوف عليهم ولا هم يحزنون** "اللہ کے ایسے بندے ہیں جو نہ پیغمبر ہیں اور نہ ہی شہداء، لیکن روز آخرت شہداء اور پیغمبر ان کے درجات اور اللہ سے ان کی قربت پر حیرت و پسندیدگی کا اظہار کریں گے۔ پھر ایک بدو اپنے گھٹنوں پر بیٹھ گیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے لیے ان کی وضاحت کریں اور انہیں بیان کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ مختلف لوگوں میں سے ہوں گے اور اپنے قبیلوں سے جدا ہوئے ہوں گے۔ وہ اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے دوستی کریں گے اور اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔ روزِ آخرت اللہ ان کے لیے نور کے منبر بنوائے گا جس پر وہ بیٹھیں گے۔ لوگوں کو اس دن خوف ہو گا مگر وہ بے خوف ہوں گے ۔ وہ اللہ عزوجل کے دوست ہیں جنہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی کوئی افسوس "۔ لسان العرب میں ہے کہ (حدیث میں موجود لفظ) **افناء** کا مطلب ہے :مختلف انواع کے ملے جلے لوگ۔

آئیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خاطر دوستی کے ذریعے ایسے لیڈرز کی نسل تیار کریں جو صحابہؓ کی پیروی کرے۔ آج کے دور میں اہلِ قوت اور بااثر لوگ زبردست کرپشن اور دنیاوی کشش کا سامنا کر رہے ہیں۔ تو آئیں ہم سب اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہم دین کو جاننے اور سمجھنے والوں کے ساتھ بیٹھنے کے لیے وقت نکالیں گے۔ ہم اس بات کو یقینی بنائیں کہ دنیاوی معاملات میں آگے نکلنے کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی بجائے ہماری آپس کی دوستی ہمیں اس بات کی طرف اُبھارے کہ ہم آخرت کے اعلیٰ درجات کے حصول کی دوڑ میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں: اسلام کا علم، اس علم پر عمل اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا کے حصول کے ذریعے۔ اور بہت جلد ہم یہ دیکھیں کہ بالآخر امت کے امور اس قیادت نے اپنے ہاتھوں میں لے لیے ہیں جس نے اپنی نگاہیں آخرت کی نعمتوں پر جمائی ہوئی ہیں، جو اللہ کے نازل کردہ کے مطابق حکمرانی کرتے ہیں اور ہمارے دین کے مخلص نگہبان ہیں۔

ختم شد

مغربی تہذیب بحران کا شکار ہے

تحریر: انجینئر معیز، پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پوری دنیا میں سرمایہ داریت بحران کا شکار ہے۔ تیسری دنیا کے لیے ترقی کرنے کے لیے بنائے گئے نمونے، جن کی بنیاد فری مارکیٹ اکانومی ہے اور جو سیاسی لبرلائزیشن کے پروگراموں کے ساتھ منسلک ہیں ، ہمیشہ ہی اس حوالے سے ہدف تنقید رہے ہیں کہ کیا یہ پروگرام ترقی پزیر ممالک کے شہریوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگیوں میں بہتری لاسکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس بار سرمایہ داریت کے صحیح ہونے کے حوالے سے خود مغربی دنیا میں سے سوالات جنم لے رہے ہیں جہاں آبادی کے بڑے حصے اور مغربی دانشور حضرات کی قابلِ ذکر تعداد مغربی معاشی اور سیاسی سوچ اور اس کے ڈھانچے پر سوالات اٹھا رہی ہے۔ یہ چیلنج مارکسِسٹ-لینن ازم کے چیلنج سے مختلف ہے۔ فرانسیسی انقلاب کی انقلابیت سے متاثر مارکس نے سرمایہ داریت پر تنقید کی جس نے انیسوی صدی کے سیاسی جذبات کو اپنے حصار میں لے لیا جہاں یورپی عوام اپنی اشرافیہ سے سخت بے زار تھے جو اپنی قانونی حیثیت بادشاہ کی جانب سے قائم کیے گئے اداروں سے لیتے تھے اور خود کو عیسائی چرچ کے محافظ کے طور پر پیش کرتے تھے۔

نپولین کا حیرت انگیز عروج اور یورپ کی فتح، جو بعد میں برقرار نہیں رہ سکی، نے انقلابی جذبات کو بھڑکا دیا جس نے یورپ کو آنے والی کئی دہائیوں تک اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ ان انقلابی جذبات کو مزید بھڑکانے میں بڑھتے ہوئے سماجی و معاشی فرق نے کردار ادا کیا جو یورپی معاشروں میں صنعتی دور کے بعد تیزی سے

تیسری دنیا کے لیے ترقی کرنے کے لیے بنائے گئے نمونے، جن کی بنیاد فری مارکیٹ اکانومی ہے اور جو سیاسی لبرلائزیشن کے پروگراموں کے ساتھ منسلک ہیں، ہمیشہ ہی اس حوالے سے ہدف تنقید رہے ہیں کہ کیا یہ پروگرام ترقی پزیر ممالک کے شہریوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگیوں میں بہتری لاسکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس بار سرمایہ داریت کے صحیح ہونے کے حوالے سے خود مغربی دنیا میں سے سوالات جنم لے رہے ہیں جہاں آبادی کے بڑے حصے اور مغربی دانشور حضرات کی قابلِ ذکر تعداد مغربی معاشی اور سیاسی سوچ اور اس کے ڈھانچے پر سوالات اٹھا رہی ہے۔

بڑھتی چلی گئی۔ مارکس نے یورپ کے انقلابی جذبات کو مٹھی میں لیا اور اُس وقت کی صورتحال کی ایک فکری توجیح پیش کی۔ اس نے یہ کہا تاریخ میں معاشرے افکار کی بنیاد پر نہیں بلکہ اشرافیہ اور غیر اشرافیہ کے مسلسل ٹکراؤ سے آگے بڑھے ہیں۔ اس نے کہا کہ اشرافیہ کے ڈھانچے معاشی ذرائع پیداوار کو اپنے کنٹرول میں لیتے ہیں، اگر ذرائع پیداوار کی ملکیت اجتماعی ہو تو اس طرح سے اشرافیہ اور غیر اشرافیہ کی تقسیم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے اور ایک مساوی معاشرے کی جانب قدم بڑھتے ہیں۔ مارکس کے "انقلابی سیاسی نظریات" نے کبھی بھی یورپ کی اشرافیہ کو متاثر نہیں کیا تھا جو ان نظریات کو اپنی بقاء کے لیے ایک خطرے کے طور پر دیکھتے تھے۔ یورپ چرچ اور مذہب مخالف قوتوں کے درمیان ہونے والی شدید جدوجہد سے باہر نکلا تھا۔ یہ ایک ایسی بحث تھی جس نے یورپ کو تقسیم کر کے رکھ دیا تھا جس کے نتیجے میں سیکولر لبرل ازم نے ایک آئیڈیالوجی کی صورت میں جنم لیا۔ یورپی اشرافیہ نے مارکس کے تاریخی ارتقاء کے نظریے کو فوراً مسترد کر دیا۔ لبرل یورپ کس طرح اس بات کو قبول کر سکتا تھا کہ انسانی معاشرے کی ترقی میں افکار اور انسانوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا جبکہ وہ کچھ ہی عرصہ قبل ایک شدید آئیڈیالوجیکل جدوجہد سے گزرے تھے اور جس کے زخم یورپی نفسیات میں ابھی تازہ تھے؟ البتہ مارکس کے "معاشی نظریات" نے یورپ کی اشرافیہ کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں کئی مغربی ممالک میں بیسوی صدی میں سوشل ڈیموکریٹک سیاست کو عروج حاصل ہوا۔ مارکس ازم نے سرمایہ دارانہ دنیا کو متحدہ ہونے میں مدد فراہم کی۔ مارکس ازم کی مدد سے سرمایہ داریت اپنی ایک واضح تعریف متعین کرنے کے قابل ہوئی کہ وہ

کن چیزوں کو اہمیت دیتی ہے اور کن چیزوں کو اہمیت نہیں دیتی ، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں اور ان اصولوں کی غیر موجودگی اور مارکس ازم کے تجربے کے کیا تباہ کن سیاسی اور معاشی نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس مقابلے کی وجہ سے اور کس طرح یہ دونوں آئیڈیالوجیز خود کو ایک دوسرے سے مختلف ثابت کرتی تھیں کے نتیجے میں فرانسز فوکویاما نے پرجوش اعلان کیا جب اس نے مشہور زمانہ سوال کیا کہ کیا کمیونزم کے خاتمے کے ساتھ ہی تاریخ کا ارتقاء بھی ختم ہو گیا ہے اور کیا لبرل ڈیموکریسی اور سرمایہ داریت انسانیت کے لیے آخری اور حتمی طرز حکمرانی ثابت ہوا ہے۔

آج سرمایہ داریت اور لبرل ڈیموکریسی جس بحران کا سامنا کر رہے ہیں وہ اس کے صحیح ہونے کا ہے جس کے وجہ سے مغربی اشرافیہ میں اعتماد کا بحران پیدا ہو گیا ہے۔ آج اشرافیہ اور مغربی معاشروں کے اہم حصے ان بنیادی تصورات پر سوالات اٹھا رہے ہیں جو کہ مغربی تہذیب کی بنیادیں ہیں۔ دیوارِ برلن کے گرنے اور 2008 کے معاشی بحران کے درمیانی بیس سال کے عرصے میں بہت بڑے پیمانے پر معاشی عالمگیریت (اکنامک گلوبلائزیشن) کو بین الاقوامی معاہدوں جیسا کہ عالمی تجارتی تنظیم (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) ، یورپی یونین اور یوروزون کے شکل میں دیکھا گیا جن کا ہدف اشیاء، سہولیات، افراد اور سرمائے کی بغیر روک ٹوک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کو یقینی بنانا تھا ۔ یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے نتیجے میں ہم ایک ایسے عالمی خوشحالی کے دور میں داخل ہوں گے جس سے ہر ایک مستفید ہو گا۔ لیکن 2008 کے معاشی بحران اور اس کے بعد عالمی مالیاتی نظام میں پیدا ہونے والے بحران نے فری مارکیٹ کے اصول پر یقین کو چیلنج کر دیا کہ یہ اصول وسائل کو معیشت میں موثر طریقے سے تقسیم کرتا ہے۔ فری مارکیٹ اکانومی میں نجی شعبے کے جو ادارے بڑا کردار ادا کرتے تھے ان کو تباہی سے بچانے کے لیے بڑے پیمانے پر حکومتی مدد (بیل آوٹ) نے ریاست اور معیشت کے درمیان تعلق کے حوالے سے سوالات پیدا کر دیے جن کا جواب اب تک نہیں دیا جا سکے ہے۔ اس کے علاوہ دیوار برلن کے گرنے کے بعد سے عالمگیریت کے اس عہد میں جو دولت پیدا ہوئی اس نے مغربی معاشروں میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے امیر اور غریب کے درمیان خلیج کو مزید وسیع کر دیا۔

سرمایہ دانہ معاشی سوچ کی بنیاد یہ فکر ہے کہ ضروریات لامحدود جبکہ وسائل محدود ہیں۔ اس سوچ نے دولت کی پیداوار، معاشی بڑھوتی اور وسائل میں اضافے کو معیشت کو کنٹرول کرنے والی قوت بنا دیا ہے۔ سرمایہ داریت یہ کہتی ہے کہ اچھی معیشت وہ ہوتی ہے جو موثر ہو کیونکہ اس کے نتیجے میں وسائل ضائع نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے پیداوار میں اضافے کو معیشت میں ترقی کا معیار بنایا گیا ہے جو کم سے کم وسائل سے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرتی ہے۔ ٹیکنالوجی میں ترقی اور اس میدان میں بڑی بڑی کمپنیوں کے ظہور کی وجہ سے پچھلی تین دہائیوں میں سرمایہ داریت نے بہت بڑی بڑی کارپوریشنز کو جنم دیا جو کم سے کم وسائل سے معیشت میں بہت بڑے پیمانے پر دولت پیدا کرتی ہیں۔ اس وجہ سے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم میں مزید اضافہ ہوا اور اس طرح سے ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بہت زیادہ پیداوار دینے والی ٹیک اکانومی نے سرمایہ دارانہ معیشت کی غیر انسانی فطرت کو واضح کر دیا۔ کیا وہ معیشت جو کم سے کم مزدوروں سے بہت زیادہ پیداوار دیتی ہے بہتر ہے یا وہ معیشت بہتر ہے جو زیادہ مزدوروں سے کم پیداوار دیتی ہے؟ کیا معیشت کی تعمیر ایسے ہونی چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیداوار دے تا کہ زیادہ دولت پیدا ہو سکے اور جو چند ہاتھوں میں ہی گردش کرتی رہے یا پھر ایک کم موثر معیشت ہو لیکن جس میں زیادہ مزدور کام کر سکیں جس کی وجہ سے معاشرے کا بڑا حصہ معاشی سرگرمیوں میں ملوث ہو؟ کیا پیداوار معیشت کا ہدف ہونا چاہیے یا مکمل روزگار معیشت کا ہدف ہو؟ کیا معاشی ترقی کو جانچنے کا واحد پیمانہ پیداوار ہی ہے؟ سرمایہ داریت کا صرف پیداوار اور دولت پیدا کرنے کے حوالے سے جنون، جو اس کی نظر میں معیشت کو چلانے کا مرکزی تصور ہے، نے دنیا کے ماحولیاتی نظام کو بری طرح سے نقصان پہنچایا ہے۔ پیداوار کو بڑھانے کے ذریعے دولت پیدا کرنے کی یہ جنونیت اور پاگل پن غیر فطری اور ناقابل برداشت ہے اور اس نے دنیا کے ماحولیاتی نظام میں ان وسائل کو شدید نقصان پہنچایا ہے جو استعمال ہونے کے بعد دوبارہ پیدا بھی ہو سکتے ہیں۔ اس عمل کی وجہ سے یہ خدشات پیدا ہو گئے ہیں کہ دنیا کے ماحول کو مستقل طور پر ایسا نقصان پہنچ جائے گا جس کی تلافی ممکن نہیں ہو گی اور اس کے نتیجے میں انسانی معاشروں پر شدید اثرات مرتب ہوں گے۔ آخر انسانی ترقی کے لیے صرف اور صرف مادی خواہشات، ذاتی ترغیبات اور منافع کی لالچ ہی ذریعے معیشت کو چلانا کیوں ضروری ہے؟ کیا صرف اسی طرح ہی سے معیشت کو چلانا ممکن ہے؟ کیا معاشی اصول معیشت کو چلانے کے لیے انسانی، روحانی

یا اخلاقی اقدار کو تسلیم نہیں کرتے جو کہ انسانی معاشرے کی بقاء کے لیے انتہائی ضروری ہیں؟

مغرب میں شناخت کی سیاست identity politics کے ابھرنے نے مغربی اشرافیہ کے تصور کو چیلنج کیا ہے جو کہ سرمایہ داریت کو ایک عالمی تہذیب قرار دیتے ہیں۔ کیا مغربی معاشرے اتنے کمزور اور نازک ہیں کہ وہ دیگر ثقافتیں برداشت ہی نہیں کرسکتے جو تارکین وطن(مہاجرین) اپنے ساتھ ان کے معاشروں میں لاتے ہیں؟ اگر مغربی معاشرے اپنے دروازے تارکین وطن پر بند کرنا چاہتے ہیں جو مختلف پس منظر رکھتے ہیں خصوصاً اسلامی پس منظر، تو پھر وہ کیسے مغربی افکار کو عالمگیر قرار دے سکتے ہیں؟ ان کے اس دعوے کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے کہ لبرل اور تکثیری معاشرہ(pluralistic society) ہی انسانی معاشروں کے لیے حتمی نمونے ہیں؟ کیا سفید فام نسل پرستی اور دائیں بازو کی مقبولیت عام سیاست محض عیسائی روایات اور مغربی تہذیب کی گہری اور جذباتی نمائندگی کرتی ہے جس کی وجہ سے یہ تہذیب صرف بحر اوقیانوس کے دونوں کناروں پر بسنے والی عیسائی اقوام ہی کی تہذیب رہ جاتی ہے؟ فرانس کی صدر میکرون کی جانب سے شمالی میسیڈونیا کی یورپی یونین میں شمولیت کو ویٹو کردینا اور امریکی صدر ٹرمپ کی خارجہ پالیسی کا کھل کر مغربی تہذیب کو جغرافیائی حدود میں مقید کرنا مغربی تہذیب کے اس دعوے کی نفی کرر ہے ہیں کہ وہ ایک عالمگیر تہذیب ہے۔

مغرب میں شناخت کی سیاست کے عروج نے مغربی دانشوروں کے ان تصورات کو بھی چیلنج کیا ہے جو وہ انسانی محرکات اور کس طرح ایک معاشرہ ان محرکات کے ذریعے ایک مخصوص شکل اختیار کرتا ہے، کے حوالے سے رکھتے ہیں۔ مغربی اشرافیہ بنیادی طور پر انسانوں کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ ان کے اعمال کا محرک صرف مادی فوائد کا حصول ہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر اوقات عقلیت کو مغرب کے مختلف طبقات اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ انسان صرف

کیا مغربی معاشرے اتنے کمزور اور نازک ہیں کہ وہ دیگر ثقافتیں برداشت ہی نہیں کرسکتے جو تارکین وطن (مہاجرین) اپنے ساتھ ان کے معاشروں میں لاتے ہیں؟ اگر مغربی معاشرے اپنے دروازے تارکین وطن پر بند کرنا چاہتے ہیں جو مختلف پس منظر رکھتے ہیں خصوصاً اسلامی پس منظر، تو پھر وہ کیسے مغربی افکار کو عالمگیر قرار دے سکتے ہیں؟ ان کے اس دعوے کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے کہ لبرل اور تکثیری معاشرہ(pluralistic society)ہی انسانی معاشروں کے لیے حتمی نمونے ہیں؟

اپنے معاشی اور ذاتی فائدے کے لیے متحرک ہوتا ہے۔ مغرب میں شناخت کی سیاست کے عروج نے مغربی معاشروں میں ہونے والی ایک بہت گہری جدوجہد کو آشکار کیا ہے اور وہ ہے کہ زندگی کا مطلب کیا ہے، مقصد کیا ہے۔ صدیوں تک مذہب کو ذاتی زندگی تک محدود رکھنے کے بعد مادی تہذیب کا کھوکھلا پن واضح ہوچکا ہے جس نے روحانیت اور مذہب کو اجتماعی زندگی میں ان کے جائز مقام سے محروم رکھا اور اس وجہ سے موجودہ سیاسی رجحانات سامنے آرہے ہیں جس میں ثقافت کے گرد گھومتی سیاست کے ذریعے اجتماعی زندگی کے معنی جاننے کی خواہش نظر آتی ہے، جس سیاست کا ہدف یہ ہے کہ مغرب کی ایک تعریف متعین کی جائے۔ اس طاقتور سیاسی لہر نے پورے مغربی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جس نے مغربی دانشوروں کو مجبور کردیا ہے کہ وہ انسانی محرکات کے حوالے سے اپنے اب تک کے نظریات پر سوالات اٹھائیں کہ آیا وہ درست ہیں یا نہیں۔ کیا انسان صرف مادی فوائد کی وجہ سے ہی حرکت میں نہیں آتا، یا یہ کہ روحانی، انسانی اور اخلاقی تقاضے کبھی معاشی تقاضوں پر اس طرح سے حاوی ہوجاتے ہیں جو مکمل طور پر ایک دانشور کو خلاف عقل معلوم ہوں جو خلاف عقل چیز کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ ایسا عمل جس سے مادی مفادات متاثر ہوتے ہیں۔ یہ اور اس جیسے دوسرے خدشات جو مغربی تہذیب کے حوالے سے سر اٹھا رہے ہیں اس نے مغرب میں ایک بحران کا احساس پیدا کردیا ہے کیونکہ جن تصورات پر سوال اٹھ رہے ہیں ان کا تعلق مغربی تہذیب کی بنیادوں سے ہے۔ اگر مغربی معاشرے کا ان بنیادی تصورات پر سے اعتماد اٹھ جائے تو اس کے بہت ہی سنگین اثرات مرتب ہوں گے اور عالمی بالادست مغربی تہذیب کی بقاء کا مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ ایک ایسے وقت میں جب مغرب اپنی اندرونی کشمکش سے نبرد آزمہ ہے مسلم دنیا بھی ایک تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے۔ 1924 میں عثمانی خلافت کے خاتمے کے بعد سے اسلامی امت ایک فکری اور سیاسی جدوجہد کے عمل سے گزر رہی ہے جو اس پر استعماریوں نے مسلط کی ہے، اور یہ جدوجہد اس کے وجود کی بقا سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا مسلم امت اپنی تاریخی بنیادوں سے جڑی رہے گی، جو کہ عظیم

اسلامی تہذیب کی علمبر دار تھی، اور اس طرح اپنے اصل مقام کو حاصل کرلے گی جو کہ ایک واحد ریاست کے سائے میں یکجا ہونا ہے جس کی قیادت ایک خلیفہ کے ہاتھ میں ہو گی جو اسلامی قوانین نافذ کرے گا اور اس کے مطابق امت کے امور کی نگہبانی کرے گا؟ یا یہ کہ مسلم دنیا مغربی تہذیب اور اس کی ثقافت کو گلے لگا لے گی اور مسلم عوام کی قومی ریاستوں میں تقسیم کو قبول کرلے گی جس کے معاملات سیکولر آئین اور قوانین کے مطابق چلائے جاتے ہیں؟

عثمانی خلافت کے خاتمے کے بعد سے اس جدوجہد نے مسلم دنیا کی اندرونی سیاست اور فکری سمت کو متعین کر دیا ہے۔ اور یہ وہ جدوجہد ہے جو اب اسلامی نشاۃِ ثانیہ میں تبدیل ہو رہی ہے جس سے اختلاف صرف بے خبر لوگ ہی کرتے ہیں۔ مسلم دنیا کے لیے یہ ایک تکلیف دہ جدوجہد ہے کیونکہ اس عرصے کے دوران امت اپنے امور کی دیکھ بھال کرنے کا اختیار کھو چکی ہے اور وہ بلواسطہ یا بلا واسطہ استعماریوں کی غلامی میں زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن اس عرصے نے مسلمانوں کو دیگر اقوام پر ایک فوقیت بھی فراہم کیونکہ مسلم دنیا اس قابل ہوئی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کے مغربی تہذیب کے ساتھ فکری اختلاف کا موازنہ کرسکے، وہ اسلامی تہذیب جس سے وہ محبت کرتی ہے مگر وہ اس کے فہم میں کمزور ہو چکی تھی۔ اس عمل نے اسلامی اور مغربی تہذیب کے فرق کو سمجھنے میں امت کی مدد کی ہے اور امت نے میں ایک بہت ہی گہری اور شدید آئیڈیالوجیکل جدوجہد کے نتیجے میں مغربی تہذیب کو مسترد کیا ہے اور وہ اسلامی تہذیب کی جانب اس یقین کے ساتھ واپس آرہی ہے کہ صرف یہی وہ چیز ہے جو اس کے امور کی نگہبانی کرسکتی ہے۔ اس طرح اسلامی امت ایک منفرد صورتحال میں ہے جہاں وہ مغربی تہذیب کا متبادل فراہم کرسکتی ہے ۔ مغربی تہذیب صرف مغرب میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں بحران کا شکار ہے جبکہ اسلامی امت پورے شعور کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہے جسے اس نے صحیح جان کر چنا ہے۔ امت اب اپنی ریاست کی واپسی کی جدوجہد اور انتظار کر رہی ہے جو کہ نبوت کے طریقے پر خلافت ہے۔ اسلامی ریاست کی واپسی اسلامی تہذیب کو ایک بار پھر زندہ کردے گی اور اس طرح دنیا کو مغربی تہذیب کا متبادل فراہم کرے گی جس پر سے مغربی اقوام اور پوری دنیا کا اعتماد ختم ہوتا جارہا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

"اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے پیغمبر (آخر الزماں) آگئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب (الٰہی) میں سے چھپاتے تھے وہ اس میں سے بہت کچھ تمہیں کھول کھول کر بتا دیتے ہیں اور تمہارے بہت سے قصور معاف کر دیتے ہیں بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے، جس سے اللہ اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا اور ان کو سیدھے رستہ پر چلاتا ہے"(المائدہ:16-15)

ختم شد

بقیہ صفحہ 41 سے

لہٰذا خلیفہ کا بہادر ہونا، یا جنگی صلاحیتوں میں ماہر ہونا، یا وسیع معلومات رکھنا، یا اعلیٰ یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونا، ان میں سے کوئی بھی بات عقد کے لیے لازمی شرط نہیں بنتی، لہٰذا ان کی غیر موجودگی خلافت کے عقد کو باطل نہیں کرتے کیونکہ ان کو لازمی شرط قرار دینے کے حوالے سے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی غیر موجودگی خلیفہ کو اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں رکاوٹ بھی نہیں بنتے۔ جنگ کی صورت میں خلیفہ کسی بھی بہادر فرد کو اس کی ذمہ داری سونپ سکتا ہے، اور اگر معاملہ ایسا ہے کہ جس میں اعلیٰ تعلیم یا ہتی افراد کی رائے کی ضرورت ہے تو خلیفہ ان امور کے ماہرین سے رجوع کرسکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بتایا ہے کہ امت کی ترجیح ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرنا ہونا چاہیے جس میں عقد کے لیے درکار لازمی شرائط اور قابل ترجیح شرائط دونوں ہی موجود ہوں۔ لیکن امت کیسی ایسے شخص کو منتخب کرلیتی ہے جس میں عقد کے لازمی شرائط تو پائی جاتی ہوں مگر قابل ترجیح شرائط پر وہ پورا نہ اترتا ہو تو اس صورت میں بھی اس کی خلافت برقرار رہے گی جب تک وہ لازمی شرائط پر پورا اترتا رہے گا کیونکہ شرعی دلائل اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

آپ کا بھائی

عطا بن خلیل ابو الرشتہ

27 محرم 1436 ہجری

20 نومبر 2014

ختم شد

مغربی اخلاقیات کی حقیقت اور اس کی فکری بنیادیں

تحریر عثمان عادل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مغرب کے اخلاقیات پاکستان کے انتہائی مختصر مگر موثر سیکولر حلقے اور مخصوص میڈیا شخصیات کا من پسند موضوع ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اس مہم جوئی میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ ثابت کر سکیں کہ بطورِ انسان اور تہذیبی افکار و اقدار کے لحاظ سے مغرب ہم سے بہت آگے ہے۔ ہم ذلت و اخلاقی پستی کے گہرے کھڈ میں گرے ہوئے ہیں جبکہ مغرب نہ صرف معاشی بلکہ انسانی رویوں اور اخلاقیات کے لحاظ سے بھی ہم سے برتر اور بہتر ہے۔ اور طنزا! یہ بات کی جاتی ہے کہ ہمارا معاشرہ مذہبی ہونے کے باوجود اخلاقیات سے عاری ہے جبکہ مغرب کا معاشرہ خدا کا انکار کرنے کے باوجود اخلاقی لحاظ سے ہم سے بہت بہتر ہے۔

دوسری طرف پاکستان کے اسلامی نظریاتی لوگ مغربی معاشرے کو جانوروں کا معاشرہ سمجھتے ہیں کہ جہاں عورت ایک کاروبار کی چیز ہے، جسم فروشی عام ہے، Incest relationship، ہم جنس پرستی جائز ہے، مغربی اقوام دوسری اقوام کے وسائل کو چوس کر انہیں بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دینے میں عار محسوس نہیں کرتیں۔ یوں یہ اسلامی نظریاتی لوگ مغرب کو اخلاقی لحاظ سے پست اور زوال زدہ قرار دیتے ہیں۔ کیا مغرب اخلاقی طور پر مسلم معاشروں سے بہتر ہے یا بدتر، مغربی اخلاقیات کی بنیادیں کیا ہیں، مغربی کے اخلاق سے متعلق افکار کی تاریخ اور پس منظر کیا ہے، اس شہر یہ میں ہم اس موضوع کے کچھ پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے یہ کہ مغرب کی اقوام اخلاقیات کو بیان کس طرح کرتی ہیں۔ مغرب کے نزدیک سب سے بنیادی اخلاقی قدر زندگی کی قدر کرنا ہے پس ایک شخص کا اپنی زندگی کو اہمیت دینا تمام اخلاقی سرگرمیوں اور اقدار کا پیمانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کی زندگی ہے اور اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ پس اس نے خوش اور بھرپور زندگی گزارنی ہے۔ یہ اس کی پہلی ترجیح ہونی چاہئے اس کے بعد وہ چیزیں آتی ہیں جنہوں وہ اہمیت دیتا ہے جیسا کہ اس کے بیوی، بچے، اثاثے وغیرہ۔ خوش زندگی گزارنے کے لیے ایک شخص کو اپنے اندر کچھ خصوصیات پیدا کرنی ہیں۔ پس اسے خود مختار ہونا ہے، خود سوچنا ہے اور اپنے فیصلوں پر اعتماد کرنا ہے۔ کوئی بھی چیز جو ایک شخص کو آزادی و خود مختاری سے سوچنے سے روکے وہ غیر اخلاقی ہے کیونکہ یہ انسان کی بنیادی صفت کے خلاف ہے۔ اسے ایماندار ہونا ہے جس میں سب سے اہم سوچ اور فکر کے ساتھ ایمانداری ہے۔ جھوٹ پر مبنی زندگی گزارنا اپنے لیے بھی اور اپنے پیاروں کے لیے بھی تباہ کن ہے، پس جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر یقین رکھنا نقصان دہ چیزیں ہیں۔ اسے دوسروں لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کرنا ہے کہ جس کے وہ حق دار ہیں۔ اگر کوئی آپ سے اچھا سلوک کرے تو آپ بھی اس سے اچھا سلوک کریں اگر کوئی آپ سے برا سلوک کرے تو آپ اسے اپنی زندگی سے نکال دیں۔ اس کے نتیجے میں اچھے رویوں کی قدر پیدا ہوتی ہے اور اس بات کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے کہ کوئی شخص دوسرے شخص کے ساتھ برا رویہ اختیار کرے۔ اپنے آپ پر فخر ایک اچھی قدر ہے، ایک انسان کو قابل فخر بننا ہے، یہ کوشش اس کو اپنے اندر سے منفی عادتوں کا خاتمہ کرنے کی طرف ابھارے گی، جب بھی اس پر ان عادتوں کا انکشاف ہو گا۔ ان اخلاقی اقدار پر عمل کر کے ہی دنیا پر ایسی زندگی وجود میں آسکتی ہے جو کہ ممکنہ حد تک بہترین ہو۔ یہ مغربی اخلاقیات کی ایک مختصر خاکہ کشی ہے۔

اخلاقیات کے اس بیان کا جائزہ لینے سے یہ بات نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ مغربی اخلاقیات کی جڑیں مذہب کی بجائے سیکولر عقیدہ سے نکلنے والے افکار میں پیوست ہیں۔ انہیں liberal ethics یا liberal morals کہا جاتا ہے۔ لبرل ازم کی سوچ یہ کہتی ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کو طے کرنے کے لیے مذہب کی ضرورت نہیں۔ ایسا انسانی عقل کی بنیاد پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ انسان مذہب کے بغیر بھی اخلاقی طور پر اچھا ہو سکتا ہے، البتہ اگر عقلی طور پر وہ یہ محسوس کرے کہ کوئی مذہبی اخلاقی اقدار درست ہے تو اسے مذہب میں سے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے مگر عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر جیسا کہ اوپر

مثال میں بیان کیا گیا کہ عقل اور فکر اہم ترین قدر ہے۔ باقی سب قدریں اس کے بعد آتی ہیں۔

مغربی فلاسفروں کے نزدیک اخلاق کے لیے درست اور غلط (مسلمانوں کی اصطلاح میں حلال و حرام) کا مذہبی پیمانہ استعمال کرنا صحیح نہیں کیوں کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح اور اسے طے کرنے کے لیے مذہب کو استعمال کرنا ایک subjectiveیعنی نسبتی چیز ہے objectiveامر نہیں۔ انسانی زندگی اور انسان کی قدر و قیمت جیسے اصول objectiveاصول ہیں کیونکہ کسی کو بھی انسانی زندگی کے قابلِ قدر ہونے سے اختلاف نہیں، پس اخلاقیات کو اسی پر استوار ہونا چاہئے۔

جہاں تک مغربی کے اخلاقی اقدار کی evolutionاور پس منظر کا تعلق ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ یورپی کے کئی ممالک اصل میں ماضی کی رومن ایمپائر کے ٹکڑے ہیں۔ رومن ایمپائر ایک عیسائی ریاست تھی۔ عیسائیت سے قبل یہاں کے لوگ مشرک تھے اور نظام ہائے حیات کے متعلق ان کے تصورات hellinisticیعنی یونانی فلاسفروں سے متاثر تھے۔

یونانی فلسفے کے مطابق انسان کا ultimate مقصد خوشی کا حصول ہے، کیونکہ خوشی ایک ایسا مقصد ہے کہ یہ بذاتِ خود مکمل ہے اور اسے مکمل ہونے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دولت کا حصول انسان کے لیے ایک مقصد ہو سکتا ہے مگر یہ بذاتِ خود مکمل نہیں ہے کیونکہ اس کا فائدہ اسی وقت ہے جب انسان اس سے کوئی چیز خرید کر استعمال کرے تو دولت بذاتِ خود ایک مکمل مقصد نہیں ہے۔ جبکہ خوشی کا حصول ایک خود مختار مقصد ہے۔ اور عقل و فکر اس وجہ سے اہم ہے کہ یہ خوشی حاصل کرنے اور اچھی زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے۔

جہاں تک عیسائیت کی بات ہے تو ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ سلام بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے اور انہیں یہودیوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہودیوں کے پاس تورات موجود تھی۔ اور تورات کا بنیادی تصور اللہ کے احکامات کی پیروی کرنا تھا، خواہ ان کا تعلق اخلاقیات سے ہو یا معاملات سے اور یہ کہ اللہ کی حکموں کی پابندی ہی انسان کا مقصدِ حیات ہے۔ عیسیٰ علیہ سلام نے بھی اللہ کے احکامات کی اطاعت کی بات کی اور یہ چیز ہمیں قرآن سے بھی پتہ چلتی ہے۔ عیسیٰ علیہ سلام کے اٹھائے جانے کے بعد عیسائیوں پر ظلم و ستم جاری رہا مگر بالآخر روم کے بادشاہ کانسٹنٹائن Constantineنے عیسائیت اختیار کر لی اور یوں عیسائیت روم کے طول و عرض میں پھیل گئی۔

اُس دور میں روم میں یونانی اور رومی فلسفیوں کے افکار پھیلے ہوئے تھے۔ اس وقت کے عیسائی علما نے اس کے مقابلے میں اپنے نظریات کو پیش کیا جو اس وقت کی عیسائی تصورات کے مطابق تھے۔ ان میں سینٹ آگسٹائن کا نام قابلِ ذکر ہے جو چوتھی صدی عیسوی کا راہب اور فلسفی تھا۔ یونانی اور رومی فلسفیانہ افکار کے مطابق دانائی اور خوشی حاصل کرنے کا ذریعہ philosophical reasoning ہے اس کے مقابلے میں سینٹ آگسٹائن نے کہا کہ خوشی مرنے کے بعد روح کے اللہ کے ساتھ ملاپ میں ہے۔ یعنی جسمانی لذتیں کمتر ہیں جبکہ آخرت کی زندگی میں انسان کی روحانی طور پر موجودگی اعلیٰ تر ہے۔ اور جہاں تک دانائی کا تعلق ہے تو وہ مذہبی ایمان اور خدا سے محبت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عیسائی فکر، خواہ وہ درست تھی یا غلط، یونانی فلسفے سے متاثر ہو گئی۔ اور اخلاقیات کے متعلق عیسائیت کے تصور کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ ہوا یوں کہ بعض عیسائی مفکرین نے عیسائیت کے ساتھ یونانی فلسفے کی مطابقت پیدا کرنے کی کوششوں کی، اور ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو کہ ابن رُشد، بو علی سینا اور فارابی کے ساتھ ہوا کہ جنہوں نے یونانی فلسفے کے ساتھ اسلام کی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش میں اسلام کی بجائے یونانی فلسفے کو فکر کی بنیاد بنا لیا۔ اس سلسلے میں تھامس اکوینس Thomas Aquanus(1225-74)کا نام نمایاں ہے کہ جو تیرہویں صدی کا عیسائی راہب اور مفکر تھا، جو ارسطو کی سوچ سے بہت متاثر تھا۔ اخلاق کے متعلق Aquanusکی فکر کو اس کے اس جملے میں سمویا جا سکتا ہے: "God is not offended by us except by what we do against our own good." اللہ ہم سے ناراض نہیں ہوتا ماسوائے ایسے عمل کے جو ہماری اپنی بھلائی کے خلاف ہو"۔ یعنی کسی عمل کے اچھا یا برا ہونے کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ کون سا عمل اس کے حق میں اچھا ہے اور

کون سا برا۔ مذہب کا مقصد بھی انسان کی بھلائی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔ تاہم جس طرح مسلمان یونانی فکر و فلسفے سے متاثر ہونے کے باوجود اسلام ہی پر عمل کرتے رہے اور اسلام ہی کو معیار بناتے رہے اگرچہ اسلام کے احکامات تک پہنچنے میں ان کا طریقہ یونانی منطق اور فلسفے سے متاثر ہو گیا تھا اسی طرح عیسائیت کے یونانی فلسفے سے متاثر ہونے کے باوجود یورپ کا معاشرہ عیسائیت پر عمل پیرا رہا اور بنیادی طور پر یہ مذہبی معاشرہ تھا۔ خواہ عیسائیت کے مفکرین کی سوچ یہ ہو گئی کہ ہمیں خدا کے قوانین کی پیروی اس وجہ سے کرنی چاہئے کہ یہ ہمارے فائدے اور بہتری کے لیے ہیں۔

عیسائیت میں پیدا ہونے والے وسیع بگاڑ کے خلاف چرچ کی اصلاح کی تحریک نے جنم لیا ، جسے protestant reformation movement کی تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک 16ویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی ۔ اس تحریک میں Martin Luther (1483–1546), John Calvin (1509–64), کا نام نمایاں ہے۔ یہ لوگ ارسطو اور دیگر فلاسفیوں کے تصورات سے بیزار تھے مارٹن لوتھر کا کہنا تھا کہ صحیح اور غلط کا پیمانہ خدا کے احکامات ہیں اور خدا کے احکامات کو اچھائی و برائی کے کسی اور آزاد پیمانے کی بنیاد پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ اور نہ ہی خدا کے احکامات کا مقصد انسان کی خواہشات کو پورا کرنا ہے، کیونکہ عیسائیت کے نزدیک انسان کی خواہشات تو ہوتی ہی کرپٹ ہیں ۔ اور نجات کی بنیاد کوئی بھی اچھا کام سرانجام دینا نہیں بلکہ نجات عیسی علیہ سلام پر ایمان اور خدا کی رحمت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ پروٹیسٹنٹ تحریک کے مختلف افکار کا جائزہ لینے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تصورات اسلام سے متاثر تھے اور کچھ مسلمان تاریخ دانوں نے یہ بیان کیا ہے کہ چرچ کی ریفارمیشن کی تحریک اسلام سے متاثر تھی۔

تاہم جس دوران یہ تحریک چل رہی تھی اسی وقت یورپ میں ایک اور سوچ جنم لے رہی تھی جس کے علمبردار لادین فلاسفر تھے جو کہ بنیاد سے ہی عیسائیت کے خلاف تھے اور مذہب کا انکار کر رہے تھے۔ ان مفکرین اور چرچ کی کشمکش کی تفصیل ہماری گفتگو کا موضوع نہیں مگر اس کے نتیجے میں جو سوچ معاشرے میں پروان چڑھی وہ یہ تھی کہ انسان مذہبی قوانین کا پابند نہیں ہے، وہ خود اپنی مرضی کے قوانین بنا سکتا ہے، اپنی مرضی سے نظام ہائے حیات کو ترتیب دے سکتا ہے۔ انسان کو مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے، وہ جس طرح چاہے اپنی زندگی گزارے ماسوائے یہ کہ اس کی آزادی کسی دوسرے کی آزادی میں مداخلت کا باعث نہ بنے۔ ان تصورات کو لبرل ازم کا نام دیا جاتا ہے۔ اور یہ دور مغرب کی تاریخ میں enlightenment کا دور کہلاتا ہے۔ لبرل مفکرین نے اخلاق کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا کیونکہ کسی عمل کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کی بحث کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے اور کسی چیز کے درست یا غلط ہونے کی بحث سے جڑی ہوئی ہے اور اسی سے یہ بحث بھی نکلتی ہے کہ آخر وہ کیا بنیاد ہے کہ جس پر یہ طے کیا جائے کہ کیا چیز کسی انسان یا معاشرے کے لیے اچھی ہے اور کونسی چیز بری، کیا درست ہے اور کیا غلط۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ یہ مفکرین مضبوطی سے اس سوچ پر جمے ہوئے تھے کہ انسان خود اپنی عقل سے طے کرے گا کہ کیا اچھا ہے کیا برا، کیا درست ہے کی غلط ۔لہٰذا اخلاق کے متعلق بھی اسی بنیاد کو اختیار کیا گیا۔ ظاہری سی بات ہے کہ اگر مقصد خدا کی رضا نہیں تو پھر لا محالہ مقصد انسان کی اپنی رضا ہے جو کہ ان مفکرین کے نزدیک جسمانی لذتوں اور خواہشات کو پورا کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کرنے کے لیے انسان کو اپنی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ پورا کرنا ہے۔ اور معاشرے کے لیے بھی وہ چیز سب سے اچھی ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے خوشی کا باعث بنے۔ اور یہی معاشرے میں کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کا پیمانہ ہے اور یہ اخلاقیات کا پیمانہ بھی ہے۔ اسے Utilitarianism کی سوچ کہا جاتا ہے۔ مشہور معیشت دان adma smith جسے سرمایہ دارانہ معیشت کا بانی تصور کیا جاتا ہے نے اپنی مشہور کتاب wealth of a nation سے قبل theory of moral philosophy تحریر کی ، اور اس کی moral philosophy کی سوچ ہی اس کی پولیٹیکل اکانومی کے سوچ کی بنیاد بنی کہ جس کے مطابق اللہ نے اس دنیا کو بنایا ہی اس لیے ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ خوشیاں مہیا کر سکے۔

جب مفکرین اخلاقیات کے متعلق بحث کر رہے تھے اور لکھ رہے تھے اسی وقت وہ زندگی کے دیگر پہلوؤں کو بھی زیر بحث لا رہے تھے۔ اس تمام کے نتیجے میں

جس سیکولر آئیڈیالوجی نے جنم لیا، اس کے نفاذ نے مغرب معاشرے میں انسانوں کے تعلقات، رویوں اوراخلاقیات کو بہت بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ اس آئیڈیالوجی کے نفاذ کے نتیجے میں مادی ترقی کا حصول اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی خواہش معاشرے کا مطمع نظر بن گئی اور نظام اس خواہش کا نگران بن کر رہ گیا۔ انسانی رویوں میں ملاوٹ پیدا ہو گئی ، رشتے ، تعلقات مادی فائدے کے حصول پر استوار ہونے لگے۔ لالچ، خود غرضی عام ہو گئی۔ اب ایک شخص کسی دوسرے شخص کا خیال اس وجہ سے نہیں رکھے گا اور بیمار ہونے پر اس کی تیمار داری اس وجہ سے نہیں کرے گا کہ مذہب اس کا حکم دیتا ہے اور یہ اس پر لازم ہے یا بلکہ اس وجہ سے کہ دوسرے کے ساتھ relationing آپ کے اپنے فائدے میں ہے، یہ مصیبت میں آپ کے کام آئے گی، آپ کے لیے کاروباری مواقع پیدا کرے گی۔ مغربی معاشرے میں ذاتی مفاد کا primaryہونا اور باقی سب چیزوں کا secondaryہونا ایک ایسی چیز ہے جسے ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ دنیا کی آسائیشوں کے حصول کی ایک دوڑ ہے جس کی طرف ہر شخص باقی سب چیزوں کو کسی حد تک نظر انداز کر کے یا یکسر پس پشت ڈال کر دوڑا چلا جاتا ہے۔

پاکستان کے وہ لوگ جو مغرب کے معاشرے کی حقیقت کو اور اس کے پس پردہ فلسفے کو گہرائی سے نہیں دیکھتے وہ مغرب کے لوگوں کے sophisticatiedاور سلجھے ہوئے انداز میں بات کرنے سے متاثر ہو جاتے ہیں اوران کچھ عادات سے impressہو جاتے ہیں جس کی وجہ ان کا productive تعلیمی نظام اور صدیوں سے نافذ ایک مخصوص ریاستی ڈھانچہ ہے۔ پس پاکستان کا مسلمان ایک شائستہ اور سلجھے ہوئے انداز میں بات کرنے والے شخص کی اچھی communication skills سے متاثر ہو تا ہے خواہ وہ شخص اپنی ذاتی زندگی میں ایک خود غرض، لالچی اور self centredانسان ہو۔

وہ لوگ جو مغرب کو اعلیٰ اخلاق کا حامل قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اخلاق گنی چنی دو چار چیزیں ہیں، کاروبار میں ایمان داری، جھوٹ نہ بولنا، دوسروں کے ساتھ نرمی سے بات کرنا اور برداشت۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا اخلاقیات ناپ طول میں کمی نہ کرنے اور ایک دوسرے کو بزنس میں دھوکہ نہ دینے تک ہی محدود ہیں۔ کیا وہ بیوی جو جنسی تعلق میں شوہر کو دھوکہ دیتی ہے یا مغرب کے جو مرد اپنی بیوی کو دھوکہ دیتے ہیں کیا یہ دھوکہ نہیں ہے۔ show off کرنا، arrogantانداز، بڑوں کا ادب نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ بد سلوکی ، گالم گلوچ اور فحش بکنا، ہمسائیوں کا خیال نہ رکھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا، کیا یہ اخلاقی برائیاں نہیں ہیں جو مغرب کے لوگوں میں عام پائی جاتی ہیں۔ کیا مغرب کا میڈیا جھوٹا پروپیگنڈا نہیں کرتا، کیا سوشل میڈیا پر جھوٹی خبروں کی فراوانی مغربی ممالک میں موجود نہیں ہے کہ جس کے متعلق وہ قوانین بنانے کی بات کرتے ہیں۔

مغرب کے اخلاقیات کو غور سے دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی دیانت داری کا تعلق زیادہ کاروباری لین دین میں دھوکہ نہ دینے اور جھوٹ نہ بولنے سے ہے، پس مغربی کمپنیاں عام طور پر پراڈکٹس کے سٹینڈرڈز کو maintianکرتی ہیں، ملاوٹ نہیں کرتیں، dealingsمیں fairnessہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی معیشتی نظام پر خاص توجہ ہے کیونکہ لوگوں کے لیے مادی دولت کے حصول کو زیادہ سے زیادہ کرنا سرمایہ دارانہ نظام کا اصل مطمع نظر ہے ، اور revivedسوسائٹی ہونے کے ناطے بزنس کے متعلق مغرب کا ایک enlightenedنقطہ نظر ہے، اور ریاست بھی اس چیز کا بہت واضح ادراک رکھتی ہے کہ کاروباری ٹرانسپیرنسی اور fainessکا نہ ہونا مجموعی معاشی سرگرمی اور ملکی معیشت کے لیے نقصان دہ ہے، پس ہمیں نظر آتا ہے کہ مغرب کے لوگ کاروباری لین دین اور Jobمیں تو کھرے ہیں مگر ذاتی زندگی میں اتنے ہی کھوٹے ہیں جتنا کہ کوئی اور معاشرہ۔

یہ پہلو اس کے علاوہ ہے کہ کاروباری ایمانداری اور سچائی کی اخلاقی صفت کس کاروبار کے لیے برتی جا رہی ہے۔ کیا شراب کی خرید و فروخت، جوئے یا قحبہ خانے کے اڈے کو ایمانداری سے چلایا جائے، سچائی کے ساتھ شراب کو بیچا جائے، دیانت داری سے جوئے کے منافع کو تقسیم کیا جائے تو کیا کوئی کام محض اس وجہ سے درست اور احسن قرار پائے گا کہ اسے سچائی اور ایمان داری سے سرانجام دیا گیا ہے۔

حقیقت میں پاکستان کے معاشرے اور مغرب کے معاشرے کے درمیان موازنہ سرے سے ہی غلط ہے۔ موازنہ تو اس بات کا ہونا چاہئے کہ لبرل

آئیڈیالوجی کے نفاذ سے قبل مغرب کے معاشرے میں ایک دوسرے کے لیے ایثار، ہمدردی، دکھ سکھ میں شریک ہونے، ہمسائیوں کا خیال رکھنے، والدین کی عزت کرنے، رشتے ناطوں کو اہمیت دینے کے جذبات کیسے تھے اور کس حد تک خالص تھے اور اب ان جذبات کی کیا صورتِ حال ہے۔ کیا لبرل آئیڈیالوجی کا نفاذ اس میں کچھ بہتری لے کر آیا ہے یا اس نے ان رویوں پر معکوس عمل کیا ہے۔ 2006 اور 2008 کے درمیان گیلپ نے ایک 145 ممالک میں ایک سروے کیا، جو کہ 145 ممالک میں کیا گیا، اس سروے نے یہ ثابت کیا کہ دنیا کے تمام مذاہب کے پیروکار، جو مذہبی عبادت ادا کرتے ہیں، ان میں سخاوت ، دوسروں پر پیسے خرچ کرنے، رضاکارانہ طور پر دوسروں کی مدد کرنے اور کسی اجنبی کی مدد کرنے کی شرح ان لوگوں سے زیادہ تھی کہ جو مذہبی عبادت کو ادا نہیں کرتے۔ یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بات تو سیکولر نظریے کو سپورٹ کرتی ہے کہ مذہب کا معاشرے میں موجود ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ شاید انفرادی حیثیت میں مذہب کا ہونا بہتر ہے۔ اور اگر مذہب لوگوں کو ایمان دار، کھرا اور دیانت دار بناتا ہے تو یہ ملکی نظام اور معیشت کے لیے بھی فائدہ مند چیز ہے۔ البتہ مذہبی تعلیمات کا ریاستی سطح پر اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نظام اور قانون کے طور پر ہونا درست نہیں۔ پس لوگوں کے اخلاق کو سنوارنے میں مذہب اپنا کردار ادا کرے اور لوگوں کی ضروریات کو انسانی عقل کی بنیاد پر انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے ذریعے پورا کیا جائے! مگر سوال یہ ہے کہ کیا مادیت کو فروغ دینے والی سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کہ جو یہ قرار دیتی ہے کہ خوشی اور اطمینان مادی ضروریات کو پورا کرنے کا نام ہے، مذہب اور نظام کے درمیان قائم کردہ اپنے اس عقلی توازن کے ذریعے لوگوں کو خوشی اور اطمینان دے سکی ہے۔ مغربی معاشرہ کس حد تک خوش اور مطمئن ہے اس کی ایک جھلک امریکہ کے نیشنل انسٹیٹیوٹ اف مینٹل ہیلتھ کے اعداد و شمار سے ملتی ہے کہ جن کے مطابق 2017 میں امریکہ میں 18 سال سے زیادہ عمر کی آبادی کے لوگوں میں 17.1 ملین لوگوں کو اپنی زندگی میں شدید ڈپریشن کا ایک اٹیک ضرور ہوا، جو کہ امریکہ کی کل آبادی کا 7.1 فیصد بنتا ہے، یعنی ہر 14 لوگوں میں سے ایک شخص شدید ڈپریشن کی بیماری کا شکار ہے۔ بزنس اِن سائیڈر Business Insider کی 2016 کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں Anti depressant کے استعمال کے لحاظ سے پہلے بارہ ممالک میں امریکہ سر فہرست ہے اور اس کے بعد علی الترتیب آئس لینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا، ڈنمارک، سویڈن، پرتگال، برطانیہ، فن لینڈ، بیلجئیم شامل ہیں جو سب کے سب مغربی ممالک ہیں اور اس کے بعد اگلے پانچ ممالک بھی مغرب سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی سپین، ناروے، لکسمبرگ، سلوانیہ، جرمنی، فرانس۔ اور پہلے چوبیس ممالک کی اس فہرست میں ایک بھی مسلمان ملک نہیں ہے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید مسلم معاشروں کے مکمل اعداد و شمار میسر نہیں۔ مگر مسلم معاشروں سے قطع نظر، یہ ایک واضح امر ہے کہ پوری دنیا کے وسائل کو چوس کر مغرب میں جمع کرنے کے بعد باوجود مغرب اپنے تمام تر لوگوں کو خوشی کی ضمانت دینے سے قاصر ہے، وہ لوگ جو دنیا کی دوڑ میں آگے نکل جاتے ہیں اور جن کی زندگی میں مشکلات کم ہیں وہ خوش ہیں اور وہ لوگ جو مغرب کے معاشرے میں کسی وجہ سے دولت ، مقام و مرتبہ یا پھر اپنی سوشل لائف میں ناکام ہو جاتے ہیں وہ نروس بریک ڈاؤن سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ لبرل آئیڈیالوجی کی فکر ان کو ذہنی سہارا دینے سے قاصر ہے، کیونکہ مغرب کے نزدیک خوشی تو محض انسان کی خواہشات کے پورا ہونے کا نام ہے ، اگر خواہشات پوری نہیں تو پھر زندگی ایک عذاب ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کی فکر خوشی و سعادت کی پختہ ضمانت دیتی ہے، کہ جس کے مطابق سعادت اللہ کی رضا میں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ابتر زندگی، نظام کی طرف سے بنیادی سہولیات کی عدم فراہمی، ظلم و جبر، ناانصافی، استحصال کے باوجود مسلم معاشرے ڈپریشن کی اس اونچی شرح سے محفوظ ہیں کہ جس سے مغربی معاشرے دوچار ہیں۔ آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر یہی صورتِ حال امریکہ کے لوگوں کو درپیش ہو تو تب وہاں ڈپریشن اور خودکشیوں کی شرح کہاں تک جا پہنچے گی، شاید پورے معاشرے کا ہی نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

مغربی معاشرے اور پاکستانی معاشرے کا اخلاقی موازنہ اس وجہ سے بھی غلط ہے مغرب کا معاشرہ ایک آئیڈیالوجیکل معاشرہ ہے اور پاکستان کا معاشرہ کسی آئیڈیالوجی کے بغیر ہے اور جہاں لوگوں کے رویے پھیلے ہوئے درست وغلط مذہبی افکار، علاقائی روایات، نظام کے supported کرپٹ معاشرتی

افکار ، لا قانونیت، کمزور عدالتی نظام کے ملغوبے کی عکاسی کرتے ہیں۔ معاشرے پر سرمایہ دارانہ افکار و تصورات کی یلغار اور کرپٹ نظام کے نفاذ کے باوجود لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے احساس کا شدت سے موجود ہونا اور جذبہ ایثاراس بات کو ظاہر کرتا ہے اگر اس معاشرے کو ایک صالح نظام میسر آ جائے تو پھر اس معاشرے کی تصویر کیا ہو گی۔ اسلام کا کامل نفاذ دوبارا قرونِ اولیٰ کی یاتازہ کر دے گا کہ جہاں جرم کی شرح انتہائی درجے کم تھی اور لوگ اطمینان اور پر سکون زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ یقیناً وہ معاشرہ اس قدر صالح معاشرہ تھا کہ آج کا جدید انسان اس کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔

اس بحث سے یہ مراد نہیں ہے کہ مغرب کے لوگوں میں اخلاق اور انسانی ہمدردی سرے سے موجود ہی نہیں ہیں بلکہ نکتہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی مغرب میں اخلاق کو پروان چڑھانے اوراخلاق کے لیے پائیدار بنیاد فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ مغرب کے لوگوں میں موجود اخلاق اور انسانی ہمدردی کی اہم وجہ وہ عیسائی اثرات ہیں جو کہ ابھی تک کسی نہ کسی حد تک مغربی معاشرے میں موجود ہیں اور یہ امر بھی کہ انسان میں موجود species instinctیعنی جبلتِ نوع انسان کو دوسرے انسانوں سے اچھابرتاؤ کرنے اور ان کی مدد کرنے کی طرف ابھارتی ہے اور دیگر جبلتوں کی مانند یہ جبلت بھی تسکین چاہتی ہے، پس ہمیں مغرب میں بھی charity، مصیبت زدوں کی مدد کرنے اور غریبوں کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کے واقعات ملتے ہیں ۔ جہاں تک پاکستان کے لوگوں میں کاروباری جھوٹ اور دھوکہ دہی کا تعلق ہے کہ جس کا اکثر تذکرہ رہتا ہے تو اس کی وجہ مذہب کی زیادہ ہونا نہیں بلکہ معاشرے اور نظام کا دین کی بنیاد پر استوار نہ ہونا ہے ، پس معاشرے میں کاروبار کے متعلق یہ غلط تصور پایا جاتا ہے کہ پاکستان میں کاروبار دھوکے کے بغیر نہیں چل سکتا، اور تھوڑی بہت ہیرا پھیری جو گاہک کے لیے قابلِ قبول ہو، جائز ہے، کاروباری ماحول کے کرپٹ ہونے میں دہائیوں سے موجود لا قانونیت اور غیر موثر عدالتی نظام کا بہت اہم کردار ہے ، مسلسل لا قانونیت کی فضا میں کاروباری دیانت داری کی توقع کرنا عبث ہے ، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ جب پاکستان کے عوام اپنے لیڈران اور حکمران اشرافیہ کی کرپشن اور لوٹ ماراور عیش و عشرت کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو اس کا لوگوں پر براہِ راست اثر ہوتا ہے، دوسری طرف پاکستانی ریاست نے سیدھے اور صاف ستھرے طریقے سے رزق کمانے کو مشکل بنا رکھا ہے،اور حکومتی ملازمین کی کم تنخواہوں کے ساتھ وسیع اختیارات اس کرپٹ ماحول کو مزید فروغ دیتے ہیں، یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ کرپشن اور اخلاقی بگاڑ ایلیٹ کلاس اور انتہائی غریب طبقے میں سب سے زیادہ ہے اور یہی طبقے اسلام سے سب سے زیادہ دور بھی ہیں۔ گویا پاکستان میں کرپشن کی وجہ مذہب نہیں بلکہ لوگوں اور نظام کی دین سے دوری ہے۔

اسلام نے جس باریکی سے شخصیت کی تعمیر اور اخلاقی رویوں کے متعلق بیان کیا ہے کوئی اور مذہب یا آئیڈیالوجی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ۔کہاں جھوٹ بولنا حرام ہے اور کہاں جائز، کہاں رحمدلی کا معاملہ کرنا چاہئے اور کہاں سختی سے پیش آنا چاہئے، کہاں غصہ کرنا حرام ہے اور کس معاملے میں فرض، کسے معاف کر دینا بہتر ہے اور کہاں بدلہ لینے میں حکمت ہے، دھوکہ کیا ہے اور کیا نہیں، غرض یہ کہ ہر صورتِ حال کے متعلق اسلام ہمیں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ تفصیلات کسی اورمذہب یا آئیڈیالوجی میں نہیں۔ اسلام اخلاقیات کو اللہ کے اوامر و نواہی قرار دیتا ہے، پس مختلف اخلاقی صفات کو اپنے اندر اس وجہ سے پیدا کرنا چاہئے کہ یہ اللہ کے احکامات ہیں نہ کہ یہ کہ ان سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا یہ صفات بذاتِ خود ایک مقصد ہیں۔ پس محض نظام کو اللہ کے اوامر و نواہی پر استوار کرنے اور معاشرے میں تقویٰ کو پروان چڑھانے سے معاشرے میں یہ اخلاقی صفات خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ معاشرے پر اسلام کا ہمہ گیر نفاذ ہی علیٰ اخلاقی اقدار کی موجودگی کی ضمانت ہے۔

ختم شد

"نئے پاکستان" کا تجربہ بھی باقی جمہوری تجربوں کی طرح اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے
کیا اب بھی اسلام کے نظامِ خلافت کی طرف لَوٹنے کا وقت نہیں آیا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستان کے گلے سڑے اور کرپٹ نظامِ حکمرانی کو سنوارنے کے لیے جو تازہ ترین تجربہ زیرِ عمل ہے، اسے اب ایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ اس "نئے پاکستان" کے تجربے کی کارگردگی کیسی رہی ؟ کیا کرپشن اور غربت کے خاتمے کے جو وعدے کیے گئے تھے، پورے ہوئے ؟ کیا ہمیں اب بھی جمہوریت کو مزید وقت دینا چاہیے یا یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت کا قیام ہی وقت کی ضرورت اور حقیقی تبدیلی ہے ؟

جہاں تک کرپشن کا معاملہ ہے تو کرپٹ ٹولہ آج بھی اپنی جمع کردہ دولت کے انبار پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے جبکہ حکومت کا اُن سے اربوں ڈالر نکلوانے کا وعدہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ پچھلی حکومتوں کے کئی کرپٹ افراد نے نئی حکومت کی صفوں میں شمولیت اختیار کر لی جبکہ حکومت کے کرتا دھرتا بھی یہ رونا روتے نظر آتے ہیں کہ حکومت کی "ٹیم" نااہل ہے۔ اور اسی کرپٹ ٹولے کے دیگر افراد، اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر، موجودہ نظام میں دوبارہ داخل ہونے کے لیے اُدھم مچا رہے ہیں کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ جمہوریت ان کے ذاتی مفادات کو تحفظ فراہم کرے گی جیسا کہ وہ کئی دہائیوں سے کرتی آ رہی ہے۔ جمہوریت میں عدلیہ ظالموں کو تحفظ فراہم کرتی ہے جس کا مظاہرہ مشرف کیس، سانحہ ساہیوال اور ریمنڈ ڈیوس کے مقدمے میں ہم سب نے دیکھا۔ جبکہ دوسری طرف مظلوم افراد دہائیوں تک عدالتوں میں دھکے کھاتے رہتے ہیں اور انہیں انصاف کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ یقیناً نئے پاکستان کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ نظام

یقیناً نئے پاکستان کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ نظام کو درست نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جمہوریت کرپشن اور ناانصافی کی فیکٹری ہے اور پوری دنیا میں جمہوریت کی یہی حقیقت ہے ۔ کرپشن کو حقیقی طور پر ختم کرنے کے لیے ہمیں جمہوری نظام سے نظریں ہٹا کر اپنے عظیم دینِ اسلام اور اس کے نظامِ حکمرانی یعنی خلافت کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔

کو درست نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جمہوریت کرپشن اور ناانصافی کی فیکٹری ہے اور پوری دنیا میں جمہوریت کی یہی حقیقت ہے۔

کرپشن کو حقیقی طور پر ختم کرنے کے لیے ہمیں جمہوری نظام سے نظریں ہٹا کر اپنے عظیم دینِ اسلام اور اس کے نظامِ حکمرانی یعنی خلافت کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلَى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقًا فَمَا أَخَذَ بَعْدَ ذَلِكَ فَهُوَ غُلُولٌ** "ہم جس کو کسی کام پر عامل بنائیں اور ہم اس کی کچھ روزی (تنخواہ) مقرر کر دیں پھر وہ اپنے مقررہ حصے سے جو کچھ بھی زیادہ لے گا تو وہ خیانت ہے "(ابو داؤد)۔ حکمران کی دولت میں غیر معمولی اضافے کو خلافت کی عدلیہ فوراً واپس لے کر ریاست کے خزانے میں شامل کر دے گی کیونکہ اسلام میں اتنا ثابت ہونا ہی کافی ہے کہ حکمران کی حکمرانی کے دوران اس کی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اور یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ کن ذرائع اور لین دین کو استعمال کر کے یہ دولت سمیٹی گئی۔ اس طرح اسلام کرپشن کے دروازے کو مضبوطی سے بند کر دیتا ہے کیونکہ اس کے قوانین اسمبلیوں میں بیٹھے کرپٹ افراد کی خواہشات اور تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتے بلکہ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا، **وَأَنِ ٱحْكُم بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ وَٱحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ** "اور (ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ) جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق ان میں فیصلہ کرنا اور ان کی خواہشوں کی پیروی کبھی نہ کرنا اور ان سے بچتے رہنا کہ یہ کسی حکم سے، جو اللہ نے آپ پر نازل فرمایا ہے ، آپ کو بہکا نہ دیں "(المائدہ 5:49)۔

جہاں تک غربت کا معاملہ ہے تو جمہوریت آئی ایم ایف (IMF) کی ظالمانہ پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ایک کھلا راستہ ہے، یہ پالیسیاں ہماری مشکلات اور تکلیفوں میں مستقل اضافہ کر رہی ہیں۔ اس حکومت کے ایک سال کے عرصے کے دوران لاکھوں افراد غربت کی لکیر سے نیچے جا چکے ہیں اور اگلے سال مزید لاکھوں افراد متوقع طور پر غربت کی لکیر سے نیچے چلے جائیں گے۔ ہزارہا افراد اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں کیونکہ کاروبار بیٹھ گئے ہیں یا بیٹھنے کے قریب ہیں، اور آئندہ سال مزید ہزاروں افراد بے روزگار ہو جائیں گے۔ بھاری ٹیکسوں کا بوجھ اُنہی لوگوں پر لاد دیا گیا ہے جو پہلے ہی غربت اور مشکلات کا شکار ہیں جبکہ کرپٹ حکومتی اشرافیہ کے لیے ٹیکس معافی (Tax Amnesty) کی اسکیمیں متعارف کرائی گئی ہیں اور استعماری کمپنیوں کو ٹیکس میں چھوٹ فراہم کی گئی ہے۔ جمہوریت ملک کو مزید سودی قرضوں کی دلدل میں دھکیل رہی ہے اور صورتحال یہ ہو چکی ہے کہ ٹیکس سے جمع ہونے والی رقم کا آدھے سے زیادہ حصہ محض سود کی ادائیگی پر خرچ ہو جاتا ہے جبکہ اصل قرض کا حجم اپنی جگہ پر ہی قائم رہتا ہے۔

غربت کے خاتمے کے لیے ہمیں جمہوریت کے نظام سے نظریں ہٹا کر اپنے عظیم دینِ اسلام اور اس کے نظامِ حکمرانی یعنی خلافت کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ ہمارا دین توانائی کے ذرائع، معدنی ذخائر اور سرکاری شعبوں کے تحت چلنے والی بڑی کمپنیوں کے ذریعے ریاست کے خزانے کے لیے بڑی مقدار میں محاصل کے حصول کو یقینی بناتا ہے۔ خلافت اس بات کو یقینی بنائے گی کہ جن صنعتوں میں بھاری سرمایہ کاری درکار ہوتی ہے وہاں ریاستی کمپنیوں کو بالادستی حاصل ہو جیسا کہ ٹیلی کمیونیکیشن، ریلویز، آبی و ہوائی جہاز رانی، تعمیرات اور بھاری مشین سازی وغیرہ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہمیں عنان، ابدان اور مضاربہ کی نوعیت کی کمپنیاں بنانے کی اجازت دیتی ہے، یہ امر طبعی طور پر نجی شعبے کے لیے وسیع سرمائے کے حصول

جہاں تک غربت کا معاملہ ہے تو جمہوریت آئی ایم ایف (IMF) کی ظالمانہ پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ایک کھلا راستہ ہے، یہ پالیسیاں ہماری مشکلات اور تکلیفوں میں مستقل اضافہ کر رہی ہیں۔ اس حکومت کے ایک سال کے عرصے کے دوران لاکھوں افراد غربت کی لکیر سے نیچے جا چکے ہیں اور اگلے سال مزید لاکھوں افراد متوقع طور پر غربت کی لکیر سے نیچے چلے جائیں گے۔ ہزارہا افراد اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں کیونکہ کاروبار بیٹھ گئے ہیں یا بیٹھنے کے قریب ہیں، اور آئندہ سال مزید ہزاروں افراد بے روزگار ہو جائیں گے۔ بھاری ٹیکسوں کا بوجھ اُنہی لوگوں پر لاد دیا گیا ہے جو پہلے ہی غربت اور مشکلات کا شکار ہیں جبکہ کرپٹ حکومتی اشرافیہ کے لیے ٹیکس معافی (Tax Amnesty) کی اسکیمیں متعارف کرائی گئی ہیں اور استعماری کمپنیوں کو ٹیکس میں چھوٹ فراہم کی گئی ہے۔

کو محدود کرتا ہے۔ خلافت اس بات کو یقینی بنائے گی کہ توانائی اور معدنیات کے شعبوں سے حاصل ہونے والے محاصل کو پوری امت پر خرچ کیا جائے نہ کہ نج کاری کے ذریعے چند لوگ ان سے حاصل ہونے والا بھاری منافع سمیٹ لیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، **الْمُسْلِمُونَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ الْمَاءِ وَالْكَلَإِ وَالنَّارِ "مسلمان تین چیزوں میں شراکت دار ہیں: پانی، چراگاہیں اور آگ (توانائی)"** (مُسندِ احمد) ۔ ہمارے دین میں محاصل اُس سے لیے جاتے ہیں جو انہیں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جیسا کہ زکوٰۃ اُس سے لی جاتی ہے جو سونے و چاندی، کرنسی، مویشیوں یا تجارتی سامان کا مالک ہو اور خراج اس سے لیا جاتا ہے جو زرعی زمین کا مالک ہو۔ اور ان محاصل کو ایسے لوگوں پر خرچ کیا جاتا ہے جو غریب، تباہ حال، قرض میں ڈوبے ہوئے اور مشکلات کا شکار ہوں۔

اے **اسلام اور مسلمانوں سے محبت کرنے والے ،پاک سرزمین کے مسلمانو!**

پوری مسلم دنیا میں کئی دہائیوں سے جمہوریت کا نفاذ یہ ثابت کر چکا ہے کہ جمہوریت کو سنوارا نہیں جا سکتا اور اب اسے لازمی طور پر مسترد اور دفن کر دینا چاہیے۔ امت شدید غربت کا شکار ہے جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کے قدموں تلے دنیا کے خزانے مدفون کر رکھے ہیں۔ امت پر حملے کیے جاتے ہیں، اس کے دین کی وجہ سے اسے ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے ، اس کے کشمیر و فلسطین جیسے علاقوں پر ایسی افواج قابض ہیں جنہیں ہرانا امت کے لیے آسان ہے کہ جس کے پاس مجموعی طور پر تیس لاکھ سے زائد قابل اور بہادر افواج موجود ہیں۔ یقیناً جمہوریت وہ سوراخ ہے جس سے امت بار بار ڈسی گئی ہے ،پس اس باطل نظام سے کسی صورت خیر کی امید نہیں رکھنی چاہیے اور نہ ہی اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے خبر دار فرمایا، **لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ " مومن کو ایک سوراخ سے دو بار ڈنگ نہیں لگتا** "(بخاری، مسلم)۔ہم سب پر لازم ہے کہ حزب التحریر کی اسلامی طرزِ زندگی کو بحال کرنے کی جدوجہد

کا حصہ بنیں کیونکہ یہی ایسی مخلص ،باخبر اور قابل قیادت ہے جو جمہوریت کے خاتمے اور نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت کے قیام کی دعوت پیش کررہی ہے۔ صرف خلافت کے قیام کے بعد ہی ہم ظلم وجبر کے دور کے خاتمے اوراسلام کی حکمرانی کے دَور کا مشاہدہ کریں گے۔ امام احمد نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث روایت کی ، **ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ "پھر جبر کی حکمرانی ہوگی، اور اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ اسے ختم کردے گا جب وہ چاہے گا۔ پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت ہوگی۔ یہ فرماکر آپ ﷺ خاموش ہوگئے "**(مُسندِ احمد)۔

اے افواجِ پاکستان کے شیرو! کرپشن اور ظلم کی نگہبان جمہوریت آج تک صرف اس لیے جاری و ساری ہے کیونکہ آپ کی قیادت میں موجود غداروں نے آپ کی طاقت کو ہمیشہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ آپ کیسے اپنی طاقت کے اس قدر غلط استعمال کو قبول کرسکتے ہیں جبکہ آپ نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ اس بات کی قسم اٹھا رکھی ہے کہ اس ملک اور اس کے لوگوں کی حفاظت کریں گے ؟! رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اسلامی ریاست انصار کی مدد ونصرت سے قائم کی تھی جو ایک عسکری و جنگی قوت تھے بالکل ویسے ہی جیسے آج آپ ایک عسکری و جنگی قوت ہیں۔ تو اب آپ پر لازم ہے کہ ایسے وقت میں کہ جب ان کرپٹ حکمرانوں کا ظلم و جبر اپنی انتہاء کو پہنچ چکا ہے، آپ نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت کے فوری قیام کے لیے حزب التحریر کو نُصرۃ فراہم کریں، ان حکمرانوں کو دبوچ لیں اور اپنی گردن سے اتار پھینکیں ،اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرلیں اور اس کے غیض وغضب سے خود کو محفوظ بنا لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ أَوْشَكَ أَن يَعُمَّهُمُ اللَّهُ بِعِقَابٍ "لوگ جب ظالم کو ظلم کرتا دیکھیں، اور اس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ سب کو اپنے عذاب میں پکڑ لے "**(ابو داؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ)۔

حزب التحریر

ولایہ پاکستان

11 ربیع الاول 1441 ہجری

8 نومبر 2019ء

ختم شد

بقیہ صفحہ 37 سے

بنادی، اسی سے نسلی صفایا اور جبری ثقافتی ادغام جیسے مسائل نے جنم لیا، اور انسانی معاملات نے وہ شکل اختیار کرلی جو قبل از اسلام کے زمانے میں تھی۔ چنانچہ قومی ریاست کی سوچ تسلط، قبضہ اور استحصال کی سوچ ہے، چہ جائیکہ یہ قوموں کے درمیان تعلقات کی بُنیاد بن جائے۔

اسلام کی نظر میں قومیتوں اور قبائل کا مقصد باہمی جان پہچان اور تعارف ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا: (يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ). " اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرسکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے۔" (الحجرات – 13) اسی طرح اسلامی ریاستِ خلافت کو گرانے میں قومیت کا بہت اثر تھا، خلافت کو ڈھادینے کے بعد قومی ریاستوں نے، جنھیں استعماری کافر نے اسلامی ریاست کے ملبے پر کھڑا کیا تھا، عالم اسلام کے اندر اقلیتوں کا مسئلہ پیدا کیا۔ اقلیتوں کے مسائل کی آڑ میں استعماری کافر کے لیے ان ریاستوں کے اُمور میں مداخلت کے لیے راہ ہموار ہوئی، اس مداخلت کا مقصد ان ٹکڑوں کے مزید ٹکڑے کرنے اور تقسیم در تقسیم کا عمل اور عالم اسلام کے اوپر اپنے قبضے کو مزید مستحکم کرنا تھا۔

قومی رجعت پسند ریاست کے برعکس اسلام کے احکام یہ بتاتے ہیں کہ ریاست کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں، ایک نسل کو دوسری نسل پر کوئی برتری حاصل نہیں، نہ ہی کسی قوم کو دوسری قوم پر کسی قسم کی فضیلت دی گئی ہے، پس کوئی عربی کسی عجمی سے بہتر نہیں، سوائے اس کے کہ وہ تقویٰ میں اس سے آگے ہو۔ اس ریاست میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کیا جاتا ہے، پس ریاست کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حکمرانی، عدالت یا دیکھ بھال وغیرہ جیسے اُمور میں اپنے رعایا کے درمیان کسی بھی قسم کی تفریق و تمیز روا رکھے، بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ قومیت، مذہب یا رنگ و نسل وغیرہ سے بالاتر ہوکر سب کو ایک نظر سے دیکھے۔

اور چونکہ اسلامی ریاست "خلافت" تمام انسانوں کے لیے ایک انسانی ریاست ہوتی ہے، یہ مغربی معنوں میں کوئی مذہبی ریاست ہے، اور نہ ہی قومی۔ چنانچہ اللہ کے اذن سے جب یہ دوبارہ قائم ہوگی تو اپنے قیام کے پہلے دن سے ہی سب کے لیے امن و انصاف اور حقوق کی ضمانت دے گی، چنانچہ اسلام کے عدل اور اس کے درست نفاذ کے نتیجے میں لوگ اللہ کے دین میں جوق درجوق داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ اس دن کی صبح جلد اپنی کرنیں دکھائے،

اَللّٰهُمَّ اٰمِيْن، وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ للهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

ختم شد

جہاد کیا ہے؟ (1)

تحریر: محمد عمران

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جہاد اسلام کا وہ حکم ہے جس کی فہم کو دانستہ طور پر پراگندہ کر دیا گیا ہے۔ اس سازش میں استعمار اور اس کے ایجنٹ حکمران پیش پیش رہے ہیں۔ نام نہاد مفکرین اور سکالرز کو ٹی وی پر لا کر جہاد سے متعلق غلط افکار کی اس طرح تشہیر کی گئی کہ امت اس واضح اسلامی حکم کے بارے میں کنفیوژن کا شکار ہو گئی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس اہم اسلامی حکم کی قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کی جائے۔

اگرچہ لفظ جہاد کے لفظی معنی "کوشش کرنے" کے ہیں تاہم شرعی اصطلاح میں جہاد صرف اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے (لاعلاء کلمة الله) کیلئے لڑنے یعنی قتال کرنے کو کہتے ہیں۔ جس طرح شہید کے لغوی معنی 'گواہ' کے ہیں لیکن شرعی اصطلاح کے طور پر 'شہید' یکسر مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ یہی معاملہ 'حدود' کا ہے جو عام معنی میں (Limits) قیود کو کہتے ہیں تاہم اس کے شرعی معانی سات مخصوص جرائم کی پاداش میں وارد ہونے والی سزائیں ہیں۔ بالکل اسی طرح جہاد ایک شرعی اصطلاح ہے جسے جب بھی مطلق طور پر استعمال کیا جائیگا اس کے شرعی معنی ہی لئے جائینگے نہ کہ لفظی معنی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے شرعی معنی وہ ہیں جو آپ ﷺ نے اپنی اس حدیث میں بیان فرمائے۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ قتال فی سبیل اللہ کیا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **((من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا، فهو في سبيل الله))** "جو کوئی اللہ کے نام کو بلند کرنے کے لئے **(لاعلاء كلمة الله)** لڑا، تو وہی اللہ کی راہ (فی سبیل اللہ) میں ہے۔ (بخاری و مسلم)۔

جہاد کی تعریف:

مشہور فقیہ ابن عابدین کہتے ہیں (الجهاد هو بذل الوسع في القتال في سبيل الله)" اللہ کے راہ میں قتال کے لئے مقدور بھر جدوجہد کرنا جہاد کہلاتا ہے"۔ امام ابن ابی زید قیروانی کی تعریف کے مطابق (وهو قِتال الكفارِ لِعلاءِ كلِمةِ اللهِ) "یہ (جہاد) اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کافروں کے خلاف قتال (جنگ) ہے"۔ چنانچہ شریعت کی رو سے اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے (اِعلاءِ كلمة الله) کے لئے قتال کے عمل میں کوشش اور محنت کرنا 'جہاد' کہلاتا ہے۔ خواہ یہ جہاد براہ راست ہو (یعنی از خود لڑنا) یا مال سے (یعنی قتال کے لئے درکار فنڈز مہیا کرنا) یا زبان سے (یعنی لوگوں کو جہاد کرنے یا اس کے لئے مال و متاع مہیا کرنے کے لئے ابھارنا)۔ لہٰذا یہ ہے جان، مال اور زبان سے جہاد کرنے کا مطلب۔ اگر یہ کوشش براہِ راست کافروں کے خلاف قتال سے متعلق نہ ہو تو پھر یہ شریعت کی رو سے جہاد نہیں خواہ اس میں مشکلات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہی معاملے بولنے اور لکھنے کا ہے کہ ان کو براہِ راست جہاد سے متعلق ہونا چاہئے محض اچھی بات کہنا یا حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا شرعی جہاد کے زمرے میں نہیں آتا۔ چنانچہ فوج یا امت کو جہاد کی ترغیب دینا، ان کی ہمت بڑھانا، ان کے سامنے دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے فضائل بیان کرنا وغیرہ جہاد باللسان کے زمرے میں آتے ہیں۔ سیاسی جدوجہد اور حکمرانوں کا محاسبہ کرنے کا اجر بہت زیادہ ہے اور امت کو اس کا عظیم فائدہ ہے تاہم اس کے باوجود یہ جہاد کی شرعی تعریف میں داخل نہیں۔ مزید برآں یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ کینسر، پولیو اور آلودگی کے خلاف کوششیں کسی صورت جہاد نہیں ہیں لہٰذا جہاد کے لفظ کو ان کوششوں کے ساتھ منسلک کرنا نا صرف ناجائز بلکہ خطرناک ہے کیونکہ ایسا کرنے سے معاشرے میں جہاد کی شرعی اصطلاح اور درست فہم پراگندہ ہوتی ہے۔ اسی طرح نفس کے خلاف "جہاد"، یا اس ابتلاء کے دور میں حق پر ڈٹے رہنا وغیرہ بھی جہاد نہیں اگرچہ یہ سب اجر کے کام ہیں۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہ کی حدیث اس حقیقت

چنانچہ شریعت کی رو سے اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے (اِعلاءِ كلمة الله) کے لئے قتال کے عمل میں کوشش اور محنت کرنا 'جہاد' کہلاتا ہے۔ خواہ یہ جہاد براہ راست ہو (یعنی از خود لڑنا) یا مال سے (یعنی قتال کے لئے درکار فنڈز مہیا کرنا) یا زبان سے (یعنی لوگوں کو جہاد کرنے یا اس کے لئے مال و متاع مہیا کرنے کے لئے ابھارنا)۔ لہٰذا یہ ہے جان، مال اور زبان سے جہاد کرنے کا مطلب۔ اگر یہ کوشش براہِ راست کافروں کے خلاف قتال سے متعلق نہ ہو تو پھر یہ شریعت کی رو سے جہاد نہیں خواہ اس میں مشکلات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

کی وضاحت کرتی ہے۔ سیدہ عائشہ نے رسول اللہ ﷺ سے استفسار فرمایا کہ کیا عورتوں کے لئے بھی جہاد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: **((نعم علیھن جھاد لا قتال فیه، الحج والعمرة))** "ہاں! ان کے لئے بھی جہاد ہے مگر اس میں قتال نہیں، یعنی حج اور عمرہ"۔ (رواہ ابن ماجہ) اس سے ملتی جلتی حدیث بخاری میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ "الجہاد" ہوتا ہی قتال ہے البتہ آپ ﷺ نے عورتوں کے لئے استثناء بتا دیا کہ ان کے جہاد میں قتال نہیں ہوتا بلکہ عورتیں جہاد جتنا ثواب حج اور عمرہ کر کے حاصل کر سکتی ہیں۔

جہاد کی فرضیت:

جہاد قرآن و سنت کی صریح نص کی بنیاد پر فرض ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: (كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ) "اور تم پر جہاد لکھ دیا گیا ہے..." (البقرہ: 216)اور فرمایا: وَقَـٰتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ لِلَّهِ"اور لڑو ان سے یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارے اللہ کے لئے ہو جائے۔"(البقرہ:193) اور فرمایا: قَـٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَلَا بِٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ ٱلْحَقِّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَـٰبَ حَتَّىٰ يُعْطُوا۟ ٱلْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَـٰغِرُونَ"لڑو ان سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ اسے حرام جانتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام گردانا، اور سچا دین قبول نہیں کرتے ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔" (البقرہ: 29)،اور فرمایا: إِلَّا تَنفِرُوا۟ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا"اگر تم (جہاد) کیلئے نہیں نکلو گے، تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔" (التوبہ: 39)، اور فرمایا؛ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَـٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا۟ فِيكُمْ غِلْظَةً" اے ایمان والو ! اپنے اطراف کے کافروں سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔"(التوبہ:123)

۔النسائی میں انسؓ سے روایت ہے ،" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:(جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ

> 'جہاد ابتدا' یا 'جہاد الطلب' یا offensive (اقدامی) جہاد امت پر فرضِ کفایہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دشمن کے خلاف جہاد کی ابتدا کریں گے خواہ دشمن نے ہمارے خلاف فوج کشی نہ بھی کی ہو، تا کہ اس ملک کو اسلامی ریاست کا حصہ بنایا جائے اور اس کے باشندوں پر اسلام کے احکامات کو نافذ کیا جائے اور اسلام کو عملی شکل میں ان کے سامنے پیش کیا جائے۔

وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ"مشرکین سے لڑو، اپنے مال، اپنی جان اور اپنی زبانوں سے۔" اور آپ ﷺ نے فرمایا:((الجِهادُ ماضٍ الى يومِ القِيامة)) "جہاد قیامت کے دن تک جاری رہے گا"بخاری میں انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) ایک صبح یا ایک شام، دنیا اور جو کچھ اس میں ہے ان سب سے بہتر ہے۔" بخاری اور مسلم میں یہ حدیث درج ہے؛(امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوان لا الہ الا اللہ، فاذا فعلو ا ذلک عصمو منی دماء ھم و اموالھم الا بحقھم) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے حکم ہے کہ میں الناس (تمام انسانوں) سے لڑوں جب تک کہ وہ اس امر کی شہادت نہ دے دیں کہ،'لا الہ الا اللہ '(اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)، اور جب تک وہ نماز نہ قائم کر دیں اور زکوٰۃ نہ دے دیں، اگر انھوں نے یہ کر لیا تو انھوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا سوائے شرعی حق کے، اور ان کا حساب اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔ اورابو ہریرہؓ سے روایت ایک اور حدیث میں فرمایا: "مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ""جو کوئی اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے جہاد میں حصہ لیا اور نہ ہی اس کی خواہش کی پس وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرا۔" (صحیح مسلم)۔ اور ابو داؤد نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:((لا تزال طائفة من متی یقاتلون عل الحق، ظاہرین علی من ناوہم حتی یقاتل آخرُہم المسیح الدجال))،" میرے امت میں ہمیشہ ایک ایسا گروہ رہے گا جو حق کیلئے لڑے گا، جو ان کی مخالفت کریں گے، یہ ان پر غالب آئے گا، اس گروہ کے آخری لوگ دجال سے جنگ کریں گے۔"اور ابنِ حبان نے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا؛ أنا محمَّدٌ وأحمدُ والمُقفِّي والحاشرُ ونَبيُّ الرَّحمةِ ونَبيُّ المَلحمةِ" میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں مقفیٰ ہوں، میں حاشر ہوں، میں نبی رحمت ہوں، اور میں جہاد کا نبی ہوں۔"

جہاد کی مختلف صورتیں:

'جہاد ابتدا' یا 'جہاد الطلب' یا offensive (اقدامی) جہاد امت پر فرضِ کفایہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دشمن کے خلاف جہاد کی ابتدا کریں گے خواہ دشمن نے ہمارے خلاف فوج کشی نہ بھی کی ہو، تا کہ اس ملک کو اسلامی ریاست کا حصہ بنایا جائے اور

اس کے باشندوں پر اسلام کے احکامات کو نافذ کیا جائے اور اسلام کو عملی شکل میں ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کے فرض کفایہ ہونے کی دلیل یہ آیت ہے:**(لاَّ يَسْتَوِيْ الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُوْلِيْ الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلاًّ وَعَدَ اللّهُ الْحُسْنَى وَفَضَّلَ اللّهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ أَجْراً عَظِيْماً)** (النساء:95) "جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے وہ اور جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت بخشی ہے اور (گو) نیکی کا وعدہ سب سے ہے لیکن اجرِ عظیم کے لحاظ سے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں زیادہ فضیلت بخشی ہے۔" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جہاد نہ کرنے والوں کی ملامت نہیں کی بلکہ ان سے بھی "نیکی کا وعدہ" کیا ہے۔ اگر اس قسم کا جہاد فرض عین ہوتا تو ایسے میں پیچھے رہ جانے والوں کو اجر کی امید نہ دلائی جاتی۔ اسی طرح ایک اور آیت جہاد کے فرض کفایہ ہونے پر دلالت کرتی ہے:**(وَمَا كَانَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي ٱلدِّينِ وَلِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوٓاْ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ)**"اور مومنوں کے لئے نہیں کہ سب کے سب (جہاد کے لئے) نکل پڑیں۔ گر ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر فرقے میں سے ایک گروہ نکلے کہ دین میں غور و فکر کرے اور اپنی قوم کو جب ان کے پاس واپس جائے خبردار کرے کہ شاید وہ محتاط ہو جائیں" (التوبہ:122)۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ تمام کے تمام مسلمان اقدامی جہاد کے لئے نہ نکلیں بلکہ کچھ دین کو سیکھنے کے لیے رک جائیں اور کچھ جہاد کے لیے نکلیں۔ اگر جہاد فرض عین ہوتا تو پھر تمام مسلمانوں کو اس کے لئے نکلنا واجب ہوتا۔ لہذا اگر مسلمان کسی بھی ملک یا قوم کے خلاف 'جہاد ابتدا' میں مصروف نہیں تو تمام مسلمان گنہگار ہونگے۔ لیکن اگر کچھ مسلمان کی شمولیت سے یہ فرض بخوبی ادا ہو رہا ہے تو یہ فرض کفایہ باقی تمام مسلمانوں کی طرف سے ادا ہو جائیگا۔

اگرچہ جہاد کے احکامات مطلق (غیر مقید) وارد ہوئے ہیں اور یہ دوسری کسی چیز کے ساتھ مشروط نہیں تاہم چونکہ جہاد ابتداً دراصل دار الاسلام کو پھیلانے کیلئے کیا جاتا ہے، اس لئے یہ امر اس بات کا متقاضی ہے کہ جہاد سے قبل ایک دارالاسلام موجود ہو۔ چنانچہ ایک اسلامی اتھارٹی ہی اقدامی جہاد کو اس کے تقاضے کے مطابق سرانجام دے سکتی ہے۔ جہاں تک دفاعی جہاد کا تعلق ہے تو یہ اس علاقے کے مسلمانوں پر فرض عین ہے جن پر دشمن حملہ آور ہوا ہو جبکہ باقی مسلمانوں پر یہ فرض کفایہ ہے۔ یہ فرض اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک دشمن کو نکال باہر نہیں کیا جاتا اور اسلامی سرزمین کفار کے رجس سے پاک نہیں ہو جاتی۔ یہ فرض بھی قریب کے مسلمانوں سے شروع ہو کر پھیلتے پھیلتے تمام دنیا کے مسلمانوں کو شامل کر لیتا ہے۔ چنانچہ افغانستان سے امریکہ کو نکالنے کے لئے نہ صرف افغان کے مسلمانوں کو جہاد کرنا ہے بلکہ اس کے قریب کے مسلمان مثلاً پاکستان، سعودی عرب اور ایران کے مسلمانوں خصوصاً ان کی افواج کو عملاً جہاد میں شامل ہونا لازمی ہے۔ تآنکہ ان کی استطاعت کافر امریکہ کو نکالنے کے لئے کفایت کر جائے۔ اگر ان علاقوں کے مسلمان یہ ذمہ داری پوری کرنے کے صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو یہ فرضیت کا دائرہ پھیلتا چلا جائیگا یہاں تک کہ اتنے مسلمان اور ان کی افواج شامل ہو جائیں جو امریکہ کو ان ممالک سے نکالنے کے لئے کافی ہوں۔ جہاد الدفع میں مسلمانوں کو لڑنے کے لئے کسی امیر، کسی حکمران اور کسی خلیفہ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی یہاں تک کہ ایک غلام کو بھی اپنے آقا کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، بیوی کو اپنے شوہر سے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے (بشرطیکہ وہ لڑنے کی اہلیت رکھتی ہو) اور بیٹے کو والدین سے اجازت کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کے علاقوں پر حملے کی صورت میں جہاد سے متعلق چند نکات پیش نظر رہنے چاہئیں:

۱) جب دشمن اسلامی سرزمین پر حملہ کرے تو افواج سب سے پہلے اس کا دفاع کرتی ہے اگر وہ اس قابل ہوں کہ دشمن کے حملے کو روک سکیں اور دفاع کر سکیں تو اس صورت میں بھی باقیوں پر ان کی مدد لازم ہے۔ امام ماوردی کہتے ہیں "کیونکہ یہ جہاد دفع ہے اسلئے اس علاقے میں ہر لڑنے کے قابل مسلمان پر یہ فرض باقی رہے گا۔" جیسا کہ 1965ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ پر حملہ کے وقت شہریوں نے افواج کی معاونت کی۔

۲) یہ کہنا کہ یہ اس علاقے کے تمام مسلمانوں پر فرض عین ہے، کا مطلب یہ ہے کہ یہ ان مسلمانوں پر فرض عین ہے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں جیسے کہ افواج اور دیگر گروہ، افراد یا قبائل جو عسکری قوت رکھتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ استطاعت کا ہونا بالواسطہ طور پر ہر حکم شرعی میں شامل سمجھا (assumed) جاتا ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (لاَ يُكَلِّفُ اللّهُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَهَا) "اللہ

کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ جو کہ ہر امر پر لاگو ہوتا ہے۔ اسلئے اس تعریف کو تبدیل کر کے یہ کہنا درست نہیں کہ جہاد صرف افواج، منظم عسکری گروہوں اور مضبوط قبائل پر ہی فرض عین ہے، کیونکہ لفظ مسلمان "عام" ہے اور اس کا یہ مطلب واضح ہے کہ یہ ان مسلمانوں پر فرض ہے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور جو اس قابلیت اور صلاحیت کے حامل ہیں کہ وہ جہاد کو اس طرح کر سکیں جیسا کہ شریعت میں طلب کیا گیا ہے۔

آج عملاً اس وقت تمام مسلم ممالک کی افواج ایجنٹ حکمرانوں کے ذریعے استعمار کے مفادات میں استعمال ہو رہی ہیں لہذا یہ ذمہ داری امت میں پائے جانے والے مخلص لوگوں کی ہے کہ وہ فوج کو اس غلامی سے نجات دلانے کے لئے سیاسی جدوجہد کریں تاکہ استعمار کے سیاسی اثر ورسوخ کا خاتمہ کرتے ہوئے انہیں ایک بار پھر جہاد کے لئے بروئے کار لایا جاسکے۔ اور یہ ہدف صرف اور صرف منہج نبوی ﷺ پر کاربند ہو کر خلافت قائم کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ خلافت کی ڈھال ہی ہے جس کے تلے منظم جہاد ممکن ہے اور اسی کے قیام سے مسلمانوں کے تمام مقبوضہ علاقوں کو عملاً آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّمَاالاِمَامُ جُنَّة يُقَاتَلُ مِن وَّرَائِهِ وَيُتَّقٰى بِهِ))"خلیفہ ڈھال ہے جس کے پیچھے مسلمان لڑتے ہیں اور تحفظ حاصل کرتے ہیں۔"(مسلم)

۳) جہاد کا ایک واضح مقصد ہے اور یہ لڑائی بغرض لڑائی نہیں، نہ ہی یہ لڑائی بغرض قتلِ کفار ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:**(وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسۡتَطَعۡتُم مِّن قُوَّةٖ وَمِن رِّبَاطِ ٱلۡخَيۡلِ تُرۡهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمۡ)**"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے ، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کیلئے مہیا کرو، تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کر سکو۔"(الانفال:60) اور فرمایا؛ **يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَرِّضِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ عَلَى ٱلۡقِتَالِۚ إِن يَكُن مِّنكُمۡ عِشۡرُونَ صَٰبِرُونَ يَغۡلِبُواْ مِاْئَتَيۡنِۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمۡ مِّاْئَةٞ يَغۡلِبُوٓاْ أَلۡفٗا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بِأَنَّهُمۡ قَوۡمٞ لَّا يَفۡقَهُونَ (٦٥) ٱلۡـَٰٔنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمۡ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمۡ ضَعۡفٗاۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّاْئَةٞ صَابِرَةٞ يَغۡلِبُواْ مِاْئَتَيۡنِۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمۡ أَلۡفٞ يَغۡلِبُوٓاْ أَلۡفَيۡنِ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۗ وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ (٦٦)**" اے نبی مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہو تو وہ ہزار منکرین حق پر غالب آئیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ اچھا اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سو آدمی صابر ہو تو وہ دو سو پر اور اگر ہزار ہو تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے۔ اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو صبر کرنے والے ہیں۔"(الانفال:65-66)۔ پہلی آیت میں تیاری کا مقصد دشمن پر رعب پڑنا ہے جو غلبے کے لئے ضرورت ہے، اسی طرح دوسری اور تیسری آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس تعداد کے بارے میں بتا رہے ہیں جو غلبے کے مقصد کے لئے ضرورت ہے۔ پس جہاد مقصد کے حصول کیلئے کیا جاتا ہے، نہ کہ صرف لڑنے کیلئے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں سلیمان بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی کسی کو فوج یا کسی دستے کا امیر مقرر کرتے تو آپ ﷺ اسے اللہ سے ڈرنے کی خصوصی تلقین کرتے اور مسلمانوں سے اچھے سلوک کی ہدایت کرتے۔ آپ ﷺ ان سے کہتے؛"۔۔۔ غنائم میں غبن مت کرو، عہد مت توڑو، مُردوں کا مثلہ مت کرو، بچوں کو مت مارو، جب تم کافر دشمن کا سامنا کرو تو انھیں تین چیزوں کی دعوت دو؛ اگر وہ کسی کو بھی قبول کر لیں تو تم بھی اسے قبول کر لو اور ان کو نقصان پہنچانے سے اپنے آپ کو روک دو۔ ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دو اگر وہ اسے قبول کر لیں، تو تم اسے قبول کر لو اور لڑائی سے

آج عملاً اس وقت تمام مسلم ممالک کی افواج ایجنٹ حکمرانوں کے ذریعے استعمار کے مفادات میں استعمال ہو رہی ہیں لہذا یہ ذمہ داری امت میں پائے جانے والے مخلص لوگوں کی ہے کہ وہ فوج کو اس غلامی سے نجات دلانے کے لئے سیاسی جدوجہد کریں تاکہ استعمار کے سیاسی اثر ورسوخ کا خاتمہ کرتے ہوئے انہیں ایک بار پھر جہاد کے لئے بروئے کار لایا جاسکے۔ اور یہ ہدف صرف اور صرف منہج نبوی ﷺ پر کاربند ہو کر خلافت قائم کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ خلافت کی ڈھال ہی ہے جس کے تلے منظم جہاد ممکن ہے اور اسی کے قیام سے مسلمانوں کے تمام مقبوضہ علاقوں کو عملاً آزاد کرایا جاسکتا ہے۔

پیچھے ہٹ جاؤ۔۔۔۔اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو انھیں جزیہ ادا کرنے کی پیش کش کرو، اگر وہ اسے قبول کر لیں تو تم بھی اسے قبول کر لو، اور اپنے ہاتھ لڑائی سے کھینچ لو۔۔۔(صحیح مسلم4294) یہ حدیث جہاد کے مقصد کی ایک اور دلیل ہے۔ پس جہاد سے کچھ امور مقصود ہیں، جیسا کہ ایک علاقے سے کفر کا نظام ہٹا کر اسلام کا نظام قائم کر کے اسے دارالاسلام کا حصہ بنانا ہے۔ پس اگر اس مقصد کا حصول ممکن نہ ہو تو اس صورت میں یہ لڑائی نہیں کی جاتی بلکہ اس کی تیاری کر کے مطلوبہ صلاحیت حاصل کی جاتی ہے تاکہ مقصد حاصل کیا جاسکے۔ یا کفار کے قبضے سے اسلامی سرزمین کو چھڑانا ہے، پس اگر صرف گوریلا مزاحمت سے یہ مقصد حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت یہ لازم ہے کہ اس طاقت کے حصول کی بھرپور کوشش کی جائے کو بھی تلاش کیا جائے جس سے اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔ مسلمان کئی دہائیوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ مسلمان اس دین کی خاطر، مظلوم مسلمانوں کی خاطر، کفار کی مزاحمت کی خاطر بڑھ چڑھ کر اپنی جانیں قربان کرتے ہیں تاہم ان تمام قربانیوں کو مسلمانوں کے غدار حکمران ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر ضائع کر دیتے ہیں، جیسا کہ کشمیر میں مزاحمتی تحریک کے ساتھ کیا گیا یا جیسا طالبان کے ساتھ کیا گیا، یا جیسا اب افغان مزاحمت کے ساتھ کرنے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ اسلئے یہ لازم ہے کہ مسلمان ان غدار حکمرانوں کو ہٹائیں اور خلافت قائم کریں وگرنہ (خدانخواستہ) جہاد کا مقصد کبھی حاصل نہیں کیا جاسکے گا۔ اگرچہ مسلمان مسلسل قربانیاں دیتے رہیں گے!!!

۴)اگر کسی علاقے پر دشمن کا قبضہ مضبوطی سے جم جائے اور وہ عملاً اس علاقے کے مسلمانوں پر مکمل طور پر غالب آجائیں تو اس صورتحال میں مسلمانوں کی حیثیت جنگی قیدیوں کی سی ہو جاتی ہے گو کہ وہ بعینہٖ جنگی قیدی نہیں ہوتے اور ان پر جہاد فرض عین نہیں رہتا، کیونکہ وہ اس علاقے کو کفار کے تسلط سے آزاد کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے، جیسا کہ آج غزہ کی صورتحال ہے یا جیسا کہ بیرونی مدد کے بغیر کشمیریوں کا حال ہے یا1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کے بیشتر حصے کی صورتحال تھی۔ اس صورت میں یہ فرض آس پاس کے مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ جہاد کر کے ان مسلمانوں کو کافر کے تسلط سے آزاد کروائیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: (وَمَا لَكُمْ لَا تُقَـٰتِلُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱلْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ ٱلرِّجَالِ وَٱلنِّسَآءِ وَٱلْوِلْدَٰنِ ٱلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْ هَـٰذِهِ ٱلْقَرْيَةِ ٱلظَّالِمِ أَهْلُهَا وَٱجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَٱجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا)"اور کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو (جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور) اللہ سے فریاد کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے۔" (النساء:75) جب مسلمانوں کا اولی الامر، امام یا خلیفہ جہادِ عام کا اعلان کرے تو یہ تمام مسلمانوں پر فرض عین بن جاتا ہے سوائے ان پر جن کو وہ ازخود مستثنیٰ قرار دے دے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: **(يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُواْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱثَّاقَلْتُمْ إِلَى ٱلْأَرْضِ أَرَضِيتُم بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا مِنَ ٱلْأَخِرَةِ فَمَا مَتَـٰعُ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فِى ٱلْأَخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ)** "اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے چمٹ کر رہ جاتے ہو، کیا تم آخرت کی زندگی کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو، (جان لو کہ) دنیا کی زندگی کی تمام متاع آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔" (التوبہ:38) اسی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:**(ٱنفِرُواْ خِفَافًا وَثِقَالاً وَجَـٰهِدُواْ بِأَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ)**"نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور لڑو اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ، یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔"(التوبہ:41) اور شیخین کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:**(و اذا استنفرتم فاانفرو)** "جب تم سے آگے بڑھنے کا کہا جائے، تو آگے بڑھو۔"

یہاں یہ اہم بات بیان کر دی جائے کہ جہاد کے حکم کا شرعی 'سبب' ایسے کفار کی موجودگی ہے جنہوں نے اس دعوت کو مسترد کر دیا ہو۔ اسی طرح جہاد کو روکنے کا شرعی 'سبب' کفار کی طرف سے مغلوب ہو کر جزیہ کی ادائیگی ہے۔ پس جب تک اس دنیا میں ایسے کافر موجود ہیں جن کو ہم نے اسلام کی دعوت دی ہو اور انھوں نے اس کو مسترد کر دیا اور وہ اسلام کی اتھارٹی کے تحت نہ ہوں تب تک مسلمانوں پر جہاد فرض کفایہ رہے گا اور مسلمانوں کو ہر دور میں ہر صورت اللہ کے سامنے اس فرض کیلئے جواب دہ ہونا ہو گا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: (وَقَـٰتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ لِلَّهِ) "اور لڑو ان سے یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے۔" (البقرہ:193) اور فرمایا: (قَـٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَلَا بِٱلْيَوْمِ ٱلْأَخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ

وَرَسُولُهُ ۥ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ ٱلۡحَقِّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ حَتَّىٰ يُعۡطُواْ ٱلۡجِزۡيَةَ عَن يَدٖ وَهُمۡ صَٰغِرُونَ)"لڑو ان سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ اسے حرام جانتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام گردانا، اور سچا دین قبول نہیں کرتے ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔" (البقرہ: 29) اور فرمایا: إِلَّا تَنفِرُواْ يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا أَلِيمٗا "اگر تم (جہاد) کیلئے نہیں نکلو گے، تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔"] التوبہ: 39[اور فرمایا: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلۡكُفَّارِ وَلۡيَجِدُواْ فِيكُمۡ غِلۡظَةٗ "اے ایمان والو! اپنے اطراف کے کافروں سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔"(التوبہ:123) ۔ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث درج ہے؛(امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوان لا اله الا الله، فاذا فعلو ا ذلک عصمو منی دماء هم و اموالهم الا بحقهم) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے حکم ہے کہ میں الناس (تمام انسانوں) سے لڑوں جب تک کہ وہ اس امر کی شہادت نہ دیدیں کہ،'لا الہ الا اللہ '(اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)، اور جب تک وہ نماز نہ قائم کر دیں اور زکوٰۃ نہ ادا دیں، اگر انھوں نے یہ کر لیا تو انھوں نے اپنی جان اور مال مجھ سے محفوظ کر لیا سوائے شرعی حق کے ، اور ان کا حساب اللہ کے ہاتھ میں ہے" یہ آیات اور حدیث واضح کرتی ہیں کہ جہاد کرنے کا شرعی 'سبب' ایسے کفار کی موجودگی ہے جنہوں نے اسلام کو مسترد کیا ہو۔ البتہ جہاد کو روکنے کا شرعی سبب ان کا چھوٹا بن کر جزیہ ادا کرنا اور اسلام کی اتھارٹی کو قبول کرنا ہے۔

جہاد صرف دفاعی نہیں:

سیکولر مغرب اور ان کے آلہ کاروں کی پوری کوشش ہے کہ جہاد کو صرف دفاع تک محدود کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمان ملکوں میں وزارت دفاع موجود ہے لیکن کہیں بھی وزارت جنگ یا جہاد نہیں۔ اگرچہ مغرب نے بھی اپنی وزارتوں کا نام دفاع ہی رکھا لیکن ان کی وزارتیں درحقیقت وزارت جنگ ہیں نہ کہ دفاع۔ جہاد قرآن، حدیث، رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ اور اجماع صحابہ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ اقدامی اور دفاعی دونوں پر مشتمل ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: وَقَٰتِلُوهُمۡ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتۡنَةٞ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ لِلَّهِ"اور لڑو ان سے یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے۔" (البقرہ :193)،اور فرمایا: قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ لَا يُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَلَا بِٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُ ۥ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ ٱلۡحَقِّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ حَتَّىٰ يُعۡطُواْ ٱلۡجِزۡيَةَ عَن يَدٖ وَهُمۡ صَٰغِرُونَ "لڑو ان سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ اسے حرام جانتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام گردانا، اور سچا دین قبول نہیں کرتے ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔" (البقرہ: 29)، اور فرمایا: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَٰتِلُواْ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلۡكُفَّارِ وَلۡيَجِدُواْ فِيكُمۡ غِلۡظَةٗ" اے ایمان والو! اپنے اطراف کے کافروں سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔" (التوبہ:123)۔ یہ مطلق احکامات ہیں اور ایسی کوئی آیات نہیں جنہوں نے ان کو منسوخ کیا ہوں یا ان کی تخصیص کی ہو۔ یعنی یہ آیات لڑنے کو اس امر سے مشروط نہیں کرتیں کہ مسلمانوں پر حملہ ہوا ہو یا کافروں نے مسلمانوں پر چڑھائی کر دی ہو۔ بلکہ یہ آیات تو یہ کہہ رہی ہیں کہ اس وقت تک لڑو "یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے"۔ نیز جہاد کو اس وقت جاری رکھنے کا حکم دے رہی ہیں جب تک کہ کافر جزیہ دے کر مسلمانوں کی اتھارٹی اور احکامات اسلامی کے سامنے سرنگوں نہ ہو جائیں۔ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث درج ہے؛(امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوان لا اله الا الله، فاذا فعلو ا ذلک عصمو منی دماء هم و اموالهم الا بحقهم) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"مجھے حکم ہے کہ میں الناس (تمام انسانوں) سے لڑوں جب تک کہ وہ اس امر کی شہادت نہ دیدیں کہ،'لا الہ الا اللہ '(اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)، اور جب تک وہ نماز نہ قائم کر دیں اور زکوٰۃ نہ دے دیں، گر انھوں نے یہ کر لیا تو انھوں نے اپنی جان اور مال مجھ سے محفوظ کر لیا سوائے شرعی حق کے ، اور ان کا حساب اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔ یہ حدیث ابن عمر، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ، اوس ابن ابواوس، ابن عباس، سہل ابن سعد، نعمان ابن بشیر، ابوبکرہ، معاذ ابن جبل، سمرہ بن جندب رضوان اللہ اجمعین نے روایت کی ہے ۔ اس حدیث میں بھی آپ ﷺ نے جہاد کو کافروں کی جارحیت کے ساتھ مشروط نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کا عمل بھی اقدامی جہاد کی تصدیق کرتا ہے۔ بدر، حنین، موتہ اور تبوک وغیرہ کے معرکے تمام کے تمام رسول اللہ ﷺ نے شروع کئے۔ اور یہی عمل خلفاء راشدین کے دور سے ملتا ہے جس پر تمام صحابہ کا اجماع بھی ہے۔(جاری ہے)

ختم شد

بھارت میں بابری مسجد-مقدمہ اور اسلامی نقطہ نظر

تحریر: ریاض بن ابراہیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

9نومبر 2019 کو بھارت کی سپریم کورٹ نے بابری مسجد کے مقدمے یا ایودھیا کے مسئلے پر اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔ یہ مقدمہ، جو کئی دہائیوں تک چلا، 2.77ایکڑ پر پھیلی اس زمین پر قبضے سے متعلق تھا جس پر 450 سال پرانی مسجد قائم تھی۔ ہندوؤں نے یہ دعویٰ کر کے تنازعہ پیدا کر دیا تھا کہ بابری مسجد ایودھیا(جو تاریخ میں ادھ کے نام سے جانا جاتا ہے) میں اس مقام پر تعمیر کی گئی تھی جہاں ہندوں کا خدا"رام" تقریباًنولاکھ سال قبل پیدا ہوا تھا۔ سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بینچ نے اپنے متفقہ فیصلے میں یہ فیصلہ دیا کہ ہندوؤں کو 2.77ایکڑ پر پھیلی اس زمین کی مکمل ملکیت دی جائے تاکہ وہ وہاں پر رام مندر تعمیر کر سکیں اور مسلمانوں کو مسجد کی تعمیر کے لیے متبادل جگہ پر 5 ایکڑ زمین دی جائے۔

یہ بات مشہور ہے کہ بابری مسجد سلطان محمود بابر کے حکم پر کمانڈر میر باقی نے 1528 عیسوی میں تعمیر کی تھی۔ تعمیر کے 350 سال بعد مہانت راغبیر داس نے فیض آباد کی عدالت سے 1885 میں بابری مسجد کے ساتھ ہی مندر تعمیر کرنے کی اجازت مانگی، جو اسے نہیں دی گئی۔ یہ وہ پہلا مقدمہ تھا جو اس تنازعہ کے حوالے سے دائر کیا گیا تھا اور جو ایک صدی سے زائد عرصے تک چلا۔ اس مقدمے کے دوران مزید کئی مقدمے قائم کیے گئے اور کئی سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان اقدامات نے رام مندر کے قیام کے حوالے سے آہستہ آہستہ صورتحال کو ہموار کیا، بالآخر بابری مسجد کو گرا دیا گیا اور نتیجتاً فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔1934 میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مسجد کے 1500 مربع گز کے احاطے سے نکال دیا گیا تھا۔ 22 اور 23 دسمبر 1949 کی رات مسجد کی بے حرمتی کی گئی اور بالا آخر 6 دسمبر 1992 میں 'کار سیواکوں' کے ہاتھوں مسجد کو منہدم کر دیا گیا جس کے بعد کچھ سال تک فرقہ وارانہ فسادات ملک بھر میں ہوتے رہے جس میں دو ہزار سے زائد افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بابری مسجد سلطان محمود بابر کے حکم پر کمانڈر میر باقی نے 1528 عیسوی میں تعمیر کی تھی۔ تعمیر کے 350 سال بعد مہانت راغبیر داس نے فیض آباد کی عدالت سے 1885 میں بابری مسجد کے ساتھ ہی مندر تعمیر کرنے کی اجازت مانگی، جو اسے نہیں دی گئی۔ یہ وہ پہلا مقدمہ تھا جو اس تنازعہ کے حوالے سے دائر کیا گیا تھا اور جو ایک صدی سے زائد عرصے تک چلا۔ اس مقدمے کے دوران مزید کئی مقدمے قائم کیے گئے اور کئی سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان اقدامات نے رام مندر کے قیام کے حوالے سے آہستہ آہستہ صورتحال کو ہموار کیا، بالآخر بابری مسجد کو گرا دیا گیا اور نتیجتاً فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔

یہ بات مشہور ہے کہ مسلمان 1949 سے کچھ عرصہ قبل مسجد کے احاطے میں بنے ایک ڈھانچے ، جسے رام چبوترا کہتے ہیں، میں ہندوؤں کو رام کے بتوں کی پوجا سے یا تو روک نہیں سکے یا اس پر اعتراض ہی نہیں کیا تھا۔ لیکن دسمبر 1949 کی ایک رات کچھ لوگوں نے مسجد میں داخل ہو کر ان بتوں کو ہٹا دیا جس کے نتیجے میں فسادات پھوٹ پڑے۔ بھارتی ریاست اتر پردیش کی حکومت نے مداخلت کی اور دونوں گروہوں کو روکا اور پھر 1950 میں عدالت نے ایک فیصلہ دیا جس میں بتوں کو مسجد سے ہٹانے سے روک دیا گیا۔ صورتحال کو برقرار رکھنے کے لیے دونوں گروہوں کے مسجد میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ۔ 1959 میں ایک درخواست نرموہی اکاہرہ(رام کے پجاریوں کے رکھوالے)نامی تنظیم نے عدالت میں جمع کرائی اور متنازعہ جگہ کی ملکیت کا دعوی کیا۔

اس درخواست نے اس معاملے کی نوعیت کو تبدیل کر دیا۔ پہلے یہ معاملہ امن وامان کے قیام اور کس کو یہاں عبادت کرنے کا حق ہے، کے حوالے سے تھا لیکن اب یہ اس جگہ کی ملکیت کا معاملہ بن گیا۔ دسمبر 1961 میں اتر پردیش کی مرکزی سنی وقف بورڈ نے مسجد کا قبضہ لینے اور وہاں سے بتوں کو ہٹانے کے لیے عدالت میں درخواست جمع کرائی، ایک طرح سے یہ ہندو تنظیم کے دعوی کا جواب تھا۔ فروری 1986 میں فیض آباد کی عدالت نے حکم دیا کہ مسجد کو کھول دیا جائے اور ہندوؤں کو مسجد میں لگے ایک جنگلے کے پیچھے عبادت کی اجازت دے دی۔ جولائی 1989 میں تریلوکی ناتھ پانڈے نامی ہندو تنظیم کی جانب سے ایک اور قانونی درخواست جمع کرائی گئی جس میں یہ دعوی کیا گیا کہ یہاں پر رام پیدا ہوئے تھے۔

2014 سے بھارت پر بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی حکومت ہے جسے آج 270 اراکین پارلیمنٹ کی حمایت کے ساتھ پارلیمنٹ میں مکمل اکثریت حاصل ہے جبکہ 1980 میں اس کی صرف دو نشستیں تھیں۔ اس جماعت کا ہمیشہ سے ہی یہ عزم رہا ہے کہ وہ اس جگہ رام مندر بنائے گی اور بھارت کو ہندو ریاست میں تبدیل کرے گی۔ ستمبر 1990 میں بی جے پی نے اپنے رہنما ایل کے ایڈوانی کی سربراہی میں ایودھیا کی جانب رام یاترا (لانگ مارچ) شروع کیا جس نے پورے بھارت میں ہندوؤں کو بنیاد پرست اور انتہا پرست بنا دیا۔ یہاں تک کہ 1991 میں عبادت گاہوں کے تحفظ کے حوالے سے منظور کیے جانے والے ایکٹ میں ایودھیا کی بابری مسجد کو اس سے استثنا دیا گیا یعنی یہ ایکٹ بابری مسجد پر لاگو نہیں کیا گیا۔ 1991 میں بی جے پی نے اتر پردیش کی ریاستی انتخابات میں کامیابی حاصل کی جس کے بعد مسجد کے آس پاس ہزاروں کی تعداد میں ہندو، رتھ یاترا کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے۔ عدالتوں اور مرکزی حکومت (نرسہا راؤ کی قیادت میں کانگریس پارٹی) کو اتر پردیش کی ریاستی حکومت (بی جے پی کے وزیر اعلیٰ کلیا سنگھ) کی جانب سے یقین دہانیاں کرانے کے باوجود ہندو انتہا پسند رضاکاروں "کار سیوا کس" نے 450 سو سال پرانی مسجد تباہ کر دی۔ یہ ایک مجرمانہ عمل تھا اور اس کے خلاف آج بھی بھارتی سپریم کورٹ میں مقدمہ زیر التواء ہے۔ اتر پردیش میں بی جے پی کی ریاستی حکومت کو ختم کرنے کے بعد جنوری 1993 میں ایک قانون "سینٹرل ایریا ایٹ ایودھیا ایکٹ" (ACAA) منظور ہوا جس کے بعد 2.77 ایکڑ زمین، جس پر کبھی بابری مسجد موجود تھی، اور اس کے آس پاس موجود تقریباً 65 ایکڑ زمین کو مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس قانون کو ڈاکٹر اسماعیل فاروقی نے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا لیکن 1994 میں عدالت نے مرکزی حکومت کی جانب سے 65 ایکٹر زمین تحویل میں لینے کے فیصلے کو احتیاطی تدبیر کے طور پر جائز قرار دیا۔

نومبر 2019 کے سپریم کورٹ کے فیصلے نے پوری کی پوری 67.73 ایکڑ زمین جس میں 2.77 ایکٹر مسجد کی زمین بھی شامل تھی ہندوؤں کو دے دی اور حکومت کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک ٹرسٹ بنائے جو رام مندر تعمیر کرائے گی اور مسلمانوں (اتر پردیش سنی وقف) کو قریب ہی 5 ایکٹر خالی زمین دی جائے۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ کچھ ان بنیادوں پر دیا گیا:

1۔ ہندوں کی جانب سے ایودھیا میں رام مندر کی اسی جگہ پر موجودگی کے زبانی اور تحریری حوالے دیے گئے جہاں پر بابری مسجد موجود تھی۔

2۔ 1885 سے مسلسل ہندو اس 2.77 ایکٹر پر محیط جگہ پر رام کے بت کی بوجا کا دعوی کرتے چلے آرہے ہیں۔

3۔ مسلمان یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ وہ اس متنازعہ جگہ کے غیر متنازعہ اور واحد مالک ہیں۔

4۔ بھارت کے آثار قدیمہ کے ادارے (اے ایس آئی) کی رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ بابری مسجد کی بنیادوں میں ایک ڈھانچے کی موجودگی کے شواہد موجود ہیں لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ڈھانچہ مندر کا ہے۔ تو اب جب حقائق سامنے رکھ دیے گئے ہیں تو ہم مسلمانوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کس

طرح اس تمام معاملے کو اسلام نقطہ نظر سے دیکھیں۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ یہ گذارشات اس صورت میں بھی درست رہیں گی اگر اس مقدمے کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں بھی ہو جاتا۔

1۔ عدالت کا حکم قانون بن جاتا ہے جس پر عمل لازمی ہو جاتا ہے۔ عدالت کا فیصلہ لوگوں کے درمیان تنازعات کو طے کرتا ہے اور اس بات کو روکتا ہے جس سے معاشرے کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، یا یہ کہ عدالت کا فیصلہ لوگوں اور نظام حکمرانی (حکمران اور انتظامیہ) کے درمیان تنازعات کو ختم کرتا ہے۔ عدالت کی بنیاد اور اس کی قانونی حیثیت قرآن و سنت کی بنا پر ہے۔ جہاں تک قرآن کی بات ہے تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا، "(اے محمد) جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کرنا "(المائدہ5:48)۔

2۔ اسلامی عدالتی نظام کے تحت کسی عدالتی مقدمے میں دعوؤں اور شہادتوں کو قبول کرنے کا ایک مخصوص پیمانہ دیا گیا ہے۔ فیصلہ اس فریق کی حق میں کیا جاتا ہے جو اپنے دعوے کے حق میں ثبوت پیش کر سکے۔ آثار قدیمہ کے ثبوت اور عوامی جذبات کسی مقدمے کے حق میں استعمال نہیں ہو سکتے۔ بابری مسجد کے مقدمے میں وقف کی مکمل عمارت کو کہانیوں (پُرانوں) میں موجود ایک کردار (یعنی رام) کے لیے دے دیا گیا۔ اور ہم یہ بات مندرجہ ذیل دلائل کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ "رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدمے کے دو فریقوں کو جج کے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا" (احمد اور

اسلامی عدالتی نظام کے تحت کسی عدالتی مقدمے میں دعوؤں اور شہادتوں کو قبول کرنے کا ایک مخصوص پیمانہ دیا گیا ہے۔ فیصلہ اس فریق کی حق میں کیا جاتا ہے جو اپنے دعوے کے حق میں ثبوت پیش کر سکے۔ آثار قدیمہ کے ثبوت اور عوامی جذبات کسی مقدمے کے حق میں استعمال نہیں ہو سکتے۔ بابری مسجد کے مقدمے میں وقف کی مکمل عمارت کو کہانیوں (پُرانوں) میں موجود ایک کردار (یعنی رام) کے لیے دے دیا گیا۔

ابو داؤد نے یہ حدیث روایت کی)۔ اور فرمایا: "ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری حق دعویٰ کرنے والے (استغاثہ) پر ہے" (بیہقی نے یہ حدیث روایت کی اور ابنِ حجر کے مطابق اس کی اسناد معتبر ہے)۔ اور اس ثبوت کو صرف عدالت میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔

3۔ اسلام کے عدالتی نظام میں فیصلہ صرف ایک جج دیتا ہے نہ کہ کئی ججوں پر مشتمل بینچ یا کئی لوگوں پر مشتمل جیوری دیتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی مقدمے میں دو جج نہیں بٹھائے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی ایک مقدمے میں ایک زیادہ جج نہیں ہو سکتا۔ جج کو ایک یا اس سے زائد لوگ اس کے ساتھ بیٹھ کر مشورہ دے سکتے ہیں لیکن ان کے مشورے جج کو پابند نہیں کرتے کہ وہ ان کے مشورے کے خلاف نہیں جا سکتا۔

4۔ اسلام کا عدالتی نظام کسی غیر انسانی شخصیت ،جیسا کہ رام، کو کسی مقدمے کا فریق تسلیم ہی نہیں کرتا۔ بابری مسجد کے مقدمے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غیر انسانی شخصیت رام کا مقدمہ ایک انسانی تنظیم لڑتی ہے۔ اسلامی احکامات لوگوں کے اعمال کے مطلق احکامات اور ان کی حدود کا تعین کرتے ہیں۔ یہ احکامات کسی شخص کو مدعی کی اجازت کے بغیر اس کا قائم مقام بن کر مقدمہ لڑنے کی اجازت نہیں دیتے۔ تنازعات میں قائم مقام کا مسئلہ اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔ علیؓ نے ابو بکرؓ کے سامنے ایک شخص کو عقیل کے قائم مقام کے طور پر پیش کیا اور کہا، "جو اس کے لیے حکم ہو گا وہ میرے لیے بھی ہو گا اور جو حکم اس پر لاگو ہو گا وہ مجھ پر بھی لاگو ہو گا"۔

5۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں کئی سو سال سے کھڑی مسجد کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا سکتا ہے اور سپریم کورٹ اس عمل کو قانونی بھی قرار دے سکتی

ہے۔ جو بھی عقل رکھتے ہیں وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جانتے بوجھتے عدالتی عمل کو اس قدر طوالت دی گئی تا کہ سیاسی و قانونی ہیرا پھیری کے ذریعے اس معاملے کو اُس مقام تک پہنچا دیا جائے جہاں من چاہا فیصلہ دیا جاسکے۔ 2015 کے اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں سپریم کورٹ سمیت تمام عدالتوں میں زیر التواء مقدمات کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ ماتحت عدالتوں سے لے کر سپریم کورٹ تک مقدمہ پہنچنے اور ان کا فیصلہ ہونے میں اوسطاً چھ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے، ہاں اگر مقدمہ کسی بہت امیر یا طاقتور شخصیت کا ہو تو یہ عمل بہت تیز ہو جاتا ہے۔ اسلام کے نظام حکمرانی خلافت میں ضروری عدالتی کارروائی کو بغیر کسی تاخیر کے چلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے عدالتی نظام میں ایک دوسرے کے اوپر عدالتیں نہیں ہوتیں اور اس کا ثبوت اجماع صحابہ ہے۔ نجران کے لوگ علیؓ کے پاس آئے اور کہا، "اے امیر المؤمنین، فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ کی معافی وہ ہے جو آپ خود دیں"۔ آپؓ نے فرمایا، "تم پر افسوس ہے، عمر سیدھے راستے پر تھے، اور میں عمر کی جانب سے سنائے گئے کسی فیصلے کو تبدیل نہیں کروں گا"۔6۔

اسلام کا عدالتی نظام اکثریت یا اقلیت کی رائے سے قطع نظر، شریعت کی حدود میں لوگوں کے حقوق کی حفاظت کو یقینی بناتا ہے۔ کسی بھی ایسے اقدام کی اجازت نہیں جس کا مقصد کسی ایک گروہ کی حمایت کرنا ہو۔ بابری مسجد کے معاملے میں یہ بات واضح ہے کہ کانگریس اور بی جے پی نے سیاسی فوائد سمیٹنے کے لیے پچھلی کئی دہائیوں میں کئی بار قوانین اور ایکٹ میں تبدیلیاں کیں۔ ہم نام نہاد جمہوریتوں میں یہ صورتحال دیکھتے ہیں کہ وہاں جذبات سے کھیلا جاتا ہے اور انقلابات انجینئرڈ (خود ساختہ) ہوتے ہیں تا کہ اپنی جماعتوں کو انتخابات میں کامیاب کرایا جائے اور اس دوران لوگوں کو شدید مشکلات اور مصائب کا شکار کر دیا جاتا ہے۔ خلافت کا نظام حکمرانی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی حدود میں رہتے ہوئے انصاف کی فراہمی کے لیے کام کرتا ہے اور اس کام کو کرنے کے لیے خلافت کو اکثریت کی حمایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسلامی نظامِ خلافت مختلف سیاسی گروہوں کی جانب سے مانگی جانے والی مراعتوں کو مسترد کر دینے سے سیاسی عدم استحکام کا شکار نہیں ہوتا جیسا کہ ہم جمہوریتوں میں دیکھتے ہیں کہ جہاں اگر ایک سیاسی گروہ کی بات تسلیم نہ کی جائے تو وہ حکمران کی حمایت سے ہاتھ کھینچ کر اسے مسند اقتدار سے اتار دیتے ہیں۔ ہم آج یہ دیکھ سکتے ہیں کہ امریکا سے یورپ اور ایشیا تک سیاسی رہنما ووٹ کے حصول کے لیے لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم یورپ کے کئی حصوں میں انتہا پسند قوم پرستوں کا ظہور دیکھ رہے ہیں جو مہاجرین کے خلاف بہت سخت موقف رکھتے ہیں اور اسی طرح بھارت میں بھی مذہبی انتہا پسندی اپنی پوری شدت کے ساتھ نظر آرہی ہے۔

خلاصہ:

مسجد کی حیثیت ایسی ہے جیسا کہ وہ زمین جس پر اسلام نافذ ہو اور اس کی یہ حیثیت کبھی تبدیل نہیں کی جاسکتی۔ بابری مسجد کے معاملے پر مسلم دنیا کے حکمرانوں کی خاموشی کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔ مسلمانوں کو لازمی اس بات کا احساس کرنا چاہیے کہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی بھی آئین اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ان احکامات کو کبھی نافذ نہیں کرتا جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عدلیہ کے لیے بنائے ہوئے ہیں۔ اب مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ صورتحال کو تبدیل کریں اور نبوت کے طریقے پر خلافت کا قیام عمل میں لائیں اور دنیا کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی شریعت کا نفاذ مسلم اور غیر مسلم لوگوں پر کر کے دکھائیں۔

ختم شد

حوالے:

https://www.bbc.com/news/world-asia-india-50355775

https://www.rt.com/news/473015-ayodhya-dispute-supreme-court/

https://en.wikipedia.org/wiki/2019_Supreme_Court_verdict_on_Ayodhya_dispute

https://indiankanoon.org/doc/37494799/

https://frontline.thehindu.com/static/html/fl1904/19040180.htm

قومی ریاست ایک رَجعت پسندانہ سوچ، انسانیت پر اس کے تباہ کُن اثرات

تحریر: بلال المہاجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُنیسویں صدی کے آواخر میں مغربی تہذیب کے دلدادہ نیم تعلیم یافتہ اشخاص کی طرف سے ایک فکر کی حیثیت سے قومی ریاست nation state کی طرف دعوت نے ریاستِ خلافت پر تباہ کُن اثرات مرتب کیے۔ مغربی قومی ریاست کی سوچ کے زیرِ اثر 1876ء کا دستور بنایا گیا، اِس دستور کی رو سے عثمانی رشتے کو اس جدید رشتے کے لیے ایک اساس کے طور پر اپنایا گیا، یہ جدید رابطہ ایسا تھا جو مختلف قومیتوں اور لسانی اختلاف کے باوجود ریاست کے تمام شہریوں اور رعایا کو، بنا کسی استثناء کے، اس بنیاد پر جوڑتا تھا کہ وہ سب عثمانی قومیت کے حامل ہیں۔ اس دستور نے نسلی رشتوں کے ظہور کا دروازہ کھول دیا کیونکہ اس کے بعد اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں طورانی اور عرب قومیتوں نے سر اُٹھالیا۔ اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اپنے آپ کو اصلاح پسند کہنے والے مغرب کے دُم چھلے اور مغربی فکر سے متاثر لوگوں نے، بقول آسٹرین مفکر Bischoff "آگ اور پانی کو یکجا کرنے" کی کوشش کی۔ اُنہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ عثمانی ریاست کو مغربی تہذیب کے ذریعے اٹھانا اور طاقتور بنانا چاہتے ہیں، مگر انہوں نے جو کارنامہ سرانجام دیا وہ یہی تھا کہ اُنہوں نے خلافت کو مسلمانوں کی عمومی ریاست سے تبدیل کرکے ایک ایسی حکومت کی شکل میں ڈھالا جو رومن امپائر سے بہت مشابہت رکھتی تھی، اوراس بات کا کوئی خیال ہی نہیں رکھا کہ اسلامی ریاست کُرۂ ارضی کے تمام اقوام کے لیے ہے، جس میں کسی بھی نسل کے افراد کو دوسروں پر کوئی برتری اور فضیلت حاصل ہوتی ہے، نہ ہی ریاست کو کسی قومی یا نسلی رنگ میں رنگنے کی کوشش

اُنیسویں صدی کے آواخر میں مغربی تہذیب کے دلدادہ نیم تعلیم یافتہ اشخاص کی طرف سے ایک فکر کی حیثیت سے قومی ریاست nation state کی طرف دعوت نے ریاستِ خلافت پر تباہ کُن اثرات مرتب کیے۔ مغربی قومی ریاست کی سوچ کے زیرِ اثر 1876ء کا دستور بنایا گیا، اِس دستور کی رو سے عثمانی رشتے کو اس جدید رشتے کے لیے ایک اساس کے طور پر اپنایا گیا۔ اس دستور نے نسلی رشتوں کے ظہور کا دروازہ کھول دیا کیونکہ اس کے بعد اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں طورانی اور عرب قومیتوں نے سر اُٹھالیا۔

کی جاتی ہے، جیسا کہ انہوں نے 1876ء کے دستور کے ذریعے کیا تھا۔ اس قانون نے اس بات کو رواج دیا کہ ریاست کے تمام باشندے عثمانی کہلائے جائیں گے، اور یہ کہ ریاست کا مملکتی مذہب اسلام اور سرکاری زبان ترکی ہوگی، یہ سب کچھ مغرب کی "نیشن اسٹیٹ" کی اندھا دھند نقل تھی۔

سلطان عبد الحمید دوئم رحمہ اللہ نے اپنی سلطنت کے پہلے سال کے تجربہ کے بعد اگرچہ 1876ء کے دستور کو تلپٹ کرکے رکھ دیا تھا، مگر جس رشتے میں اسلامی ریاست اپنے آخری ادوار میں اپنے باشندوں کو جوڑتی رہی تھی، اُس رشتے کی سوچ اس کے دل و دماغ پر سوار رہی۔ چنانچہ سلطان عبد الحمید دوئم نے عثمانی ریاست کو اس سے بچانا چاہا۔ اس کے لیے انہوں نے عثمانی رابطہ کی جگہ اسلامی لیگ یا رابطۂ اسلامی کو بنیاد بنانا چاہا، لیکن یہ بھی بجائے خود مغربی سوچ سے متاثر ہونے کی دلیل تھا، کیونکہ اسلامی ریاست ایک دن کے لیے بھی اس قسم کے روابط کے ساتھ جُڑی یا ان پر کھڑی رہی، نہ ہی مسلمان کسی بھی زمانے میں "اپنی ریاست" کی بقا کی خواہشمند رہے، اگر ایسی کوئی خواہش ان کی تھی تو اس یقین کی وجہ سے تھی کہ اسلام ایک دین ہے، ریاست اس کا جزو ہے، اور اسلام کو حکمران کے بغیر نافذ نہیں کیا جاسکتا ۔ انہی تصورات اوراعتقادات کے سبب مسلمانوں نے اپنی ریاست کی حفاظت کی اور اس کے ساتھ اپنی وفاداری نبھاتے رہے۔ اسلامی لیگ وغیرہ کے افکار مغربی فکر یا نیشن اسٹیٹ کے تصور سے متاثر ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

ابتداء میں جس امر کو عثمانی رشتے کا نام دیا گیا، اس کو ایجاد کرنے کی کوشش ایک طرح کی پیوندکاری یا اسلامی ریاست اور قومی ریاست کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی ایک جد وجہد تھی، جو اس زمانے میں مغربی یورپ میں عُروج پر تھی۔ اُن دنوں یہ سوچ

مشرقی یورپ، بشمول بلقان کی طرف اپنا راستہ بنانے لگی تھی۔ بلقان عثمانی ریاست کی ایک طفیلی ریاست تھی۔ نیز یہ ان شرعی احکامات کو لپیٹ کر نظر انداز کر دینے کی کوشش تھی جو ریاست اور اس کی اسلامی رعایا کے درمیان تعلقات کی بندوبست سے متعلق ہیں، کیونکہ اس رشتے کے مطابق وطنیت کا قانون بنایا گیا، جس کا منبع ریاست کے اندر سیاسی تعلقات کے بندوبست کے حوالے سے مخصوص عمرانی معاہدہ Social Contract تھا۔ عثمانی ریاست میں عثمانی عصبیت پر زور دے کر قومی ریاست کی نقل کرنے کی جو روش اپنائی گئی تھی، اس کی وجہ سے اصلاح پسندوں نے اسلامی ریاست کو زوال کے دہانے لا کھڑا کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا وجود اسلامی تصورات کے ساتھ نہیں جوڑا گیا تھا، جو اسلام کے نفاذ اور اس کو ایک عالمی پیغام کے طور پر پیش کرنے کے لیے ریاست کی موجودگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اب ریاست اپنے وجود کے جواز کے لیے وطن اور ہم وطنی کے اصول کا سہارا لینے لگی، سلطان یا حاکم کو اب عوام یا اُمّت کا نمائندہ ہونے کی بنا پر سندِ جواز فراہم کیا جانے لگا، جیسا کہ قومی ریاست کے سایے تلے مغرب میں ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے وطنی اور قومی تحریکوں کے لیے اپنے قومی اور وطنی نعرے بلند کرنے کے لیے دروازے چوپٹ کھل گئے۔ اسی سے نسلی قومیت نے شعلہ لیا۔ جب کہ عثمانی ربط و رشتے جیسا رشتہ، جس کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں تھا، موجودہ نسلی رشتے کے اپنے مخصوص مزاج میں ظاہر ہوئے بغیر پیدا کرنا مشکل تھا، بالخصوص اس فکری انحطاط کے دور میں جو اُس زمانے میں اُمتِ مسلمہ پر چھایا ہوا تھا۔ کیونکہ 1976 کے دستور نے عثمانی ربط و رشتے کے اعتراف کے ساتھ، بھلے یہ اعتراف غیر ارادی طور پر ہی سہی، برادریوں اور قومیتوں کو بھی سیاسی تنظیم سازی کے لیے ایک بنیاد قرار دیا، یہ سیاسی تنظیم سازی ایگزیکٹیو باڈی کے فریم کے اندر تھی، جسے

عثمانی ریاست کے انہدام اور سقوطِ خلافت کے ساتھ، جس میں قومیت اور وطنیت کے نعروں کا بڑا کردار تھا، قومی ریاست کی تباہ کن سوچ کے اثرات ختم نہیں ہوئے، کیونکہ وہ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں، جنہیں استعماری کافروں نے خلافت کے ملبے کے اوپر کھڑا کیا تھا، نے پبلک لا کے تحت قومی اور وطنی ریاست کی سوچ کو اپنے لیے ایک اساس قرار دیا، جس سے وہ اپنے وجود کے لیے جواز حاصل کریں گی۔ چنانچہ استعماری کافروں کے لئے اب ان ریاستوں کے اندر بے چینی کی صورتحال پیدا کرنے اور قومی ریاست کی سوچ اور ہم وطنی یا عمرانی معاہدے کی فکر کے درمیان امتزاج سے نتیجے کے طور پر آمد ہونے والی کمزوری کے ذریعے، اُن کے اُمور میں مداخلت کرنے کے لیے اقلیتی گروہوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا آرام تھا۔

ریاست کے نام سے جانا جاتا تھا۔ عثمانی ریاست کے انہدام اور سقوطِ خلافت کے ساتھ، جس میں قومیت اور وطنیت کے نعروں کا بڑا کردار تھا، قومی ریاست کی تباہ کن سوچ کے اثرات ختم نہیں ہوئے، کیونکہ وہ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں، جنہیں استعماری کافروں نے خلافت کے ملبے کے اوپر کھڑا کیا تھا، نے پبلک لا کے تحت قومی اور وطنی ریاست کی سوچ کو اپنے لیے ایک اساس قرار دیا، جس سے وہ اپنے وجود کے لیے جواز حاصل کریں گی۔ چنانچہ استعماری کافروں کے لئے اب ان ریاستوں کے اندر بے چینی کی صورتحال پیدا کرنے اور قومی ریاست کی سوچ اور ہم وطنی یا عمرانی معاہدے کی فکر کے درمیان امتزاج سے نتیجے کے طور پر آمد ہونے والی کمزوری کے ذریعے، اُن کے اُمور میں مداخلت کرنے کے لیے اقلیتی گروہوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا آرام تھا۔

میں اس حقیقت کو ایک اقتباس کے ذریعے مختصر بیان کرنا چاہوں گا، یہ اقتباس "عراق 1920 اور 1930 کے درمیان" سے متعلق برطانوی ریسرچ سکالر راجر اوین کے ایک لیکچر سے لیا گیا ہے، یہ لیکچر اس نے 1993ء میں عراقی کلچرل پلیٹ فارم کی طرف سے منعقدہ کانفرنس میں دیا تھا۔ اس کا عنوان تھا" قومیت، اس کی نشوو نما، نظریات، اعتراضات اور مسائل"۔ اوین نے کہا: "پہلی عالمی جنگ کے بعد جب برطانیہ نے جدید ریاست کا اعلان کیا، تو اکثریت اور اقلیت کے مسئلہ کھڑا ہوا، اسی طرح کمیونٹیز کی تعریف اور ان کی نئی شناخت کی تعیین پر اختلافات سامنے آئے، وہ کہتا ہے: 1930 کے بعد عراق کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا گیا، اور شناخت کا مسئلہ دوبارہ کھڑا ہوا۔

قومی ریاست کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے "ایک ریاست کے فریم میں کسی مخصوص قوم کا ایک سیاسی نظم"۔ مغربی قانون دان اور سیاسی نظاموں کے ماہرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ریاست کا تین عناصر پر مشتمل ہونا ضروری ہے؛ لوگ، زمین اور ان دونوں پر عمومی

اختیارات۔ اور قومی ریاست تین عناصر کے پائے جانے پر تشکیل پاتی ہے:

1- یہ کہ وہ زمینی سیاسی سرحدوں کے اندر قائم ہو، اس کی بنیاد پر وہ مادی قوتوں کی ملکیت کا جواز سمیٹ لیتی ہے، تعلقات منظم کرنے اور تنازعات کو ختم کرنے کا اختیار حاصل کرتی ہے۔

2- دوسرا عنصر کسی ایک قومیت کی تاریخی یا ثقافتی و تہذیبی عامل کی موجودگی۔

3- تیسرا عنصر دفاع، لازمی تعلیم اور جنرل ٹیکس وصول کرنے کا حق۔

تاریخ کے مطابق قومی ریاست سب سے پہلے انگلینڈ میں سترھویں صدی میں قائم ہوئی، پھر اٹھارھویں صدی کے اواخر میں فرانس میں، اور اُنیسویں صدی میں جرمنی اور اٹلی میں قائم ہوئی۔ حقیقت میں اگرچہ قومی ریاست کا سنگِ بنیاد ویسٹ فیلیا کانفرنس 1648ء میں ہی رکھا گیا تھا، جس میں عالمی توازن کا نظریہ پیش کیا گیا تھا، جس کے مطابق اگر کوئی ریاست دیگر ریاستوں کے وجود کے لیے خطرہ بن کر توسیع کی کوشش کرے گی، تو تمام ریاستیں اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے اکٹھی ہو کر دفاع کریں گی، تاکہ عالمی توازن کی حفاظت کی جائے، جو جنگ روکنے اور امن عام کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔

جہاں تک مارکسی تعلیمات کا تعلق ہے، تو اس کے مطابق قومی ریاست کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ جاگیر دارانہ یا سرمایہ دارانہ ظلم کے خلاف عوامی انقلابات کا نتیجہ ہوتی ہے، اور یہ سرمایہ دارانہ حکومتوں کی قومی بورژواBourgeoisies کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔ قومی آزادی کے اس مرحلے میں کیمونسٹ پارٹی کی قیادت تلے پرولتاری (مزدور) proletariat تحریک کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اکثریتی قوتوں کے ساتھ جُڑ جائے، کیونکہ وہی میدان کا طاقتور ترین طبقہ ہے۔ ان کی تعلیمات کے مطابق سرمایہ دارانہ قومی ریاست بیرونی طور پر عنقریب استعمار کی جانب اور داخلی طور پر ظلم و ستم کی طرف چلنے لگتی ہے، اس لیے حقیقی قومی آزادی اور قومی ریاستوں کے درمیان سرحدوں کا خاتمہ صرف مزدور طبقہ (پرولتاریہ) کے حکمرانی تک پہنچنے سے ہو گا۔ چنانچہ اس سے اس بات کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے کہ اشتراکی (سوشلسٹ) ریاستیں دیگر اقوام کی قومی آزادی کی تحریکوں کی پشت پناہی کرتی ہیں۔

چونکہ درست عقلی تحقیق ہی درُست نتیجہ یا ایک حقیقت کے بارے میں صحیح فیصلے تک پہنچاتی ہے، ایسی تحقیق جو کسی حقیقت کو محسوس کرنے اور سابقہ معلومات کے ساتھ اس حقیقت کے ربط کو سوچ کی بنیاد بناتی ہے، مادہ کو سوچ کا منبع نہیں بناتی، چنانچہ قومی ریاست کی حقیقت کو بھی اسی اساس پر دیکھنا ضروری ہے۔ اس طرح اس حقیقت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ قومی ریاست کی سوچ ایک رجعت پسندانہ سوچ ہے، جس نے انسانوں کو قومی اور قبائلی رشتوں کی طرف دھکیلا، یا وطنیت کی طرف، خواہ کتنی ہی اچھی صورت میں ہو، ان سب کو قومیت کے روابط کا نام دیا جاسکتا ہے، اسی سوچ نے قومیت، فاشزم اور نازی ازم کی راہ ہموار کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی ریاست کی سوچ اپنی ہلاکت کے اسباب کو اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے، یہ ان تمام مشکلوں سے نظر آتا ہے، جو حقیقت میں اس فکر کو نافذ کرنے کی کوششوں کے دوران نمودار ہوتی ہیں۔ یہاں اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ انسانی تعلقات کو منظم کرنے کے لیے ریاست ہی ایک ڈھانچہ ہے جس تک انسانی سوچ کی رسائی ہوئی ہے، لیکن قومی ریاست کی سوچ کے نفاذ کے ساتھ خواہ یہ نفاذ جزوی شکل میں اور اقلیتوں کے حقوق کو چھیڑے بغیر ہی کیوں نہ تھا، مختلف مشکلات، ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ اس لیے کہ یہ بات ناممکن سی ہے کہ کوئی ملک مختلف قومیتوں سے خالی ہو، چونکہ لفظ قومیت لاطینی لفظ Natio سے نکلا ہے، جس کے معنی قومیت یا کسی قومیت کی طرف نسبت کے ہیں، اس بنا پر قومی ریاست، جیسا کہ اس کی یورپین تعریف ذکر کی گئی ہے؛ یہ کسی ایک قوم کی ریاست ہوتی ہے، جہاں اس قومی ریاست کی جغرافیائی حدود کے اندر کسی اور قوم کا لحاظ نہیں کیا جاتا، اور اٹل جغرافیائی حدود ہی تمام عوامل میں سے وہ پہلا عامل ہیں جن کی تکمیل ریاست کے لیے ضروری ہوتی ہے تاکہ اس کو ایک قومی ریاست کا نام دیا جاسکے۔

دوسرے عامل یعنی تہذیبی و ثقافتی عامل کے حصول کے لیے، جس کا حصہ زبان و تاریخ بھی ہیں، ضروری ہے کہ قومی ریاست اقلیتوں کا نسلی صفایا کر کے ان کو کچلنے یا مقتدرہ قومیت میں مدغم کر دینے پر کام کرے، چاہے یہ اقلیتیں قدیم زمانے سے موجود اصل اقلیتیں ہوں، جو اس ملک کے اندر قومی ریاست کے قیام سے قبل موجود ہوں، جیسے مشرقی یورپ میں جرمن اقلیتیں، اور یورپ میں بسنے والے یہودی اور جپسی وغیرہ، یا وہ اقلیتیں ہوں جنہوں نے دورِ حاضر میں قومی ریاستوں کی طرف ہجرتیں کیں، جیسے مغربی دنیا میں آکر بسنے والے آج کل مسلمانوں کی حالت ہے۔

قومی ریاست میں وہاں کی غالب قومیت راج کرتی ہے، جس کی وجہ سے تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے نام

پر، جس میں اس غالب قومیت کی تاریخ و زبان بھی شامل ہیں، تباہی اور ادغام(amalgamation) لازمی قرار پاتا ہے۔ نیز جب اس قوم پرست سوچ کو نافذ کیا جاتا ہے، تو اس سے حقیقی مسائل جنم لیتے ہیں، جیسے اقلیتوں کا مسئلہ، جو قومی ریاست کا حتمی نتیجہ ہے، بشمول اس کے کہ قومی ریاست اس عمرانی معاہدے social contract کی فکر سے بھی متناقض ہے، جو مغربی فکر کا شاخسانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے فریم ورک میں جمہوری حکومت کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے۔اس عمرانی معاہدہ کے مطابق افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ اور خود مختار روابط ہوتے ہیں، یہ روسو Rousseau تھا جس نے اسے عمرانی معاہدہ کا نام دیا تھا۔ فرد اور ریاست کے درمیان اس معاہدے کی اساس پر، وفاداری ریاست کے لیے ہوتی ہے، اور ریاست اور فرد کے درمیان تعلقات بنتے ہیں۔ یہ تعلق یعنی ہم وطنیت قومی ریاست کی فکر کے ساتھ ٹکراتا ہے، جو نسلی یا قومی نسبت کی عکاس ہوتی ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی انقلاب نے، جو فرانس میں قومی ریاست کے ظہور کے دور میں برپا ہوا تھا، قومیت کی تعریف کو تلپٹ کرنے کی کوشش کی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس انقلاب نے قومی ریاست اور معاہدہ عمرانی کو یکجا کرنا چاہا، چنانچہ فرانسیسی انقلاب کے گمان میں یہی تھا کہ وہ ایک جدید قوم کی تاسیس کر رہا ہے، جس کا بائیولوجیکل منبع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا واحد منبع ہم وطنوں کی طرف سے آزادانہ فیصلہ ہے، جو بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کے سایے میں مشترکہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں، اور یہ وہی امر ہے جو مغربی افکار میں عوام کی بالادستی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی بنا پر فرانسیسی قومی انقلاب نے یہ مشہور کیا تھا کہ یہ آئیڈیالوجیکل (نظریاتی) معاشرے کی قومیت ہے، آزاد اختیارات کی حامل قومیت، ہم وطنوں کی قومیت، اور یہ وہ حقیقی قومیت نہیں جو کسی خاص نسل سے تعلق رکھتی ہو، نہ ہی یہ پرانے لوگوں کی قومیت ہے۔ اس طرح فرانسیسی انقلاب نے جدید فرانسیسی قومیت کی اس جدید تعریف کے ذریعے فرانس کے یہودیوں کو بھی عوام یا فرانسیسی قومیت میں ضم کرنا ممکن بنایا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی مسائل جو قومی ریاست کے نفاذ کے ساتھ رونما ہوئے تھے، قومیت کی اس جدید تعریف کی بدولت ختم ہوگئے، جو قومیت یا نسلی قومیت کی حقیقت سے متناقض تعریف ہے، کیونکہ اس کے بعد بھی بالخصوص فرانس جیسی ریاست میں فرانسیسی قوم کے لئے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی حفاظت کا مسئلہ برابر قائم رہا۔ یہ بات یورپی اقوام بالخصوص فرانسیسیوں کی ان پالیسیوں سے واضح ہوتی ہے، جو وہ عالم اسلام سے نئے وارد ہونے والوں کے لیے بناتے ہیں، سو وہ اگرچہ اپنے اوپر فرانسیسی دستور کے مطابق فرانسیسی قوانین کے نفاذ کو تسلیم کر لیتے ہیں، نیز وہ ہم وطنیت کو اپنے اور فرانسیسی ریاست کے درمیان ایک معاہدہ کے طور پر قبول کر لیتے ہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ریاست میڈیا اور ثقافتی مہم کے ذریعے مسلمانوں کو فرانسیسی معاشرہ یا ان کی تعبیر میں فرانسیسی قومیت میں مدغم کرنے کے لیے ان کے تعاقب میں لگی رہتی ہے، بلکہ فرانسیسی ریاست نے کھیل کے قوانین ہی بدل ڈالے۔ ریاست کی سوچ یہ ہے کہ قوانین مسلط کر کے مسلمانوں کو تہذیبی لحاظ سے فرانسیسی معاشرہ میں مدغم کیا جائے، چنانچہ ہم وطنیت یا وفاداری کے قانون کے لیے نئی شرائط لاگو کی گئیں۔ چنانچہ فرانس میں مسلمانوں کے سامنے دو آپشن رکھے جاتے ہیں، یا تو وہ ہم وطنیت کے قوانین کی پابندی کریں، یا پھر وہ ہم وطنیت اور ماتحتی سے دستبردار ہو جائیں۔ حالانکہ ان کا تو دعویٰ یہ ہے کہ بالادستی عوام کی ہے، اور عوام ہی قوانین بناتی ہیں، تو ان کے لیے یہ کیسے ممکن ہوا کہ فرانسیسی انقلاب کے بعد ان کی جدید تعریف کے مطابق جس قومیت کو اُنہوں نے ایجاد کیا تھا، وہ اس کے برخلاف قوانین میں ردّ وبدل کریں، حالانکہ فرانسیسی قوم کا ایک بڑے طبقہ اس کی مخالفت کرتا ہے ؟ یہ ناممکن تھا اگر غالب نسلی اکثریت جو فرانسیسیوں سے ہی مل کر بنی ہے، اپنی قومی ریاست کے تحفظ کی خاطر معاشرے کو انہی کے مخصوص تہذیبی وثقافتی رنگ میں رنگنے کی خواہشمند نہ ہوتی، کیونکہ صرف اسی صورت میں ہی قومی ریاست کے عناصر اس کے اندر مکمل طور پر پائے جائیں گے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قومی ریاست اور عمرانی معاہدہ کو آپس میں خلط ملط کرنے کی غرض سے قومیت کی جدید تعریف پر ان کا اتفاق اس مشکل کا مداوا نہیں تھا۔ یہ فقط ایک نامعقول بات تھی جس کا جھوٹ اتنا واضح ہے کہ اس کو بے نقاب کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ قومی ریاست کی سوچ صرف نفاذ میں ہی نہیں بلکہ اپنی بنیاد میں باطل اور لغو سوچ ہے۔

قومی ریاست کی سوچ ایک رجعت پسندانہ سوچ ہے جس نے نسلی و قومی نسبتوں کی بنیادوں پر لوگوں کے درمیان تفریق پیدا کی، اور زمین کے باشندوں، بشمول اس کو اپنانے والوں پر مصائب اور حادثات لے کر آئی، یہ قومی فخر و غرور کی پرورش کرتی ہے، چنانچہ اس سوچ نے اس ریاست کے بااختیار لوگوں کے لیے اپنے ہم وطنوں کے اندر قومی اور وطنی جذبات ابھار کر ان کو سرمایہ دارانہ استعماری مفادات کی خاطر جنگوں میں جھونک دینے کی تحریک سہل

بقیہ صفحہ 23 پر

جنرل باجوہ کا مخمصہ

تحریر: خالد صلاح الدین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بھارت کی جانب سے مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے آئین کے آرٹیکل 370 اور 35A کو منسوخ کرنا اور اس کو بھارتی یونین میں انضمام کرنے کا فیصلہ پاکستان، اس کی حکمران اشرافیہ اور خصوصاً آرمی چیف جنرل باجوہ کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ موجودہ بحران اور مشرف دور کے بحران کے درمیان بہت ہی منفرد مماثلت ہے کیونکہ یہ دونوں بحران خطے میں امریکی اسٹریٹیجک منصوبے پر عمل درآمد کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

مشرف سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ افغانستان میں امریکا کی فوجی موجودگی اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کے قیام کے لیے کام کرے جس پر پاکستان کا کوئی براہ راست اثر ورسوخ نہیں ہو گا۔ جبکہ آج باجوہ سے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ بھارت کی جانب سے آئین کے آرٹیکل 370 اور 35A کو منسوخ کیے جانے کے عمل کو نا صرف کامیاب بنائے بلکہ بھارتی فوج کی اس طرح سے مدد کرے کہ اگر اس آئینی تبدیلی کے خلاف کشمیر میں بغاوت پھوٹ پڑے تو وہ اسے کچل سکے۔ لہٰذا ایک عمل نے افغان عوام کے ساتھ ہمارے تعلقات کو شدید متاثر کیا تو دوسرے عمل نے کشمیر اور بھارت پر ہمارے اثر انداز ہونے کی صلاحیت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس طرح مشرف اور باجوہ دونوں نے جس امتحان کا سامنا کیا اس میں کامیابی کے لیے امت کو اس طرح سے دھوکہ دیا کہ وہ یہ تصور کرے کہ ہماری فوجی قیادت تو ہمارے ملک کے تحفظ کے لیے کام کر رہی ہے۔

امریکا کو غیر مشروط اور مسلسل حمایت فراہم کرنے کے مشرف کے فیصلے کو افواج پاکستان اور امت نے انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ لیکن مشرف نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے "پہلے پاکستان" کا نعرہ لگایا اور یہ توجیح پیش کی کہ امریکا کے ساتھ مخاصمانہ تعلقات نہیں رکھے جاسکتے۔ اس کے برخلاف کئی اصولی افسران، جیسا کہ جنرل مظفر عثمانی اور جنرل محمود، نے مشرف کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور انہیں اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی، لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ مختلف رستہ بھی اپنایا جاسکتا تھا۔ اس طرح مشرف نے اپنی غداری کو پاکستان کی بقاء کے پردے میں چھپایا اور کامیابی سے افغانستان کے لیے امریکی منصوبے کو نافذ کیا۔ مشرف نے امریکی اتحاد میں شمولیت کو جائز اور درست ثابت کرنے کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ، "۔۔۔ہماری خود مختاری، دوسرا ہماری معیشت، تیسرا ہمارے اسٹریٹیجک اثاثے (ایٹمی اور میزائل)، اور چوتھا ہمارا کشمیر کاز"۔ ان چار شرائط کے متعلق جھوٹی تسلی آج سب کے سامنے واضح ہے۔

باجوہ جس بحران کا سامنا کر رہا ہے وہ زیادہ سنجیدہ نوعیت کا ہے کیونکہ اسے کشمیر پر بھارتی جارحیت کا جواب دینا ہے۔ یہ وہ بات ہے جس پر افواج پاکستان بلکہ پاکستان کے معاشرے کی تعمیر کی گئی ہے۔ لہٰذا باجوہ اس مخمصے کا شکار ہے کہ وہ اپنی غداری پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا جواز اور کہانیاں پیش کرے جس کے ذریعے وہ نہ صرف امریکی منصوبے کو مکمل کرے بلکہ اپنے عہدے کو بھی برقرار رکھ سکے۔ باجوہ کو جس مخمصے کا سامنا ہے وہ بہت شدید ہے کیونکہ بھارت کے خلاف جہاد کے حوالے سے افواج اور امت میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔ اس صورتحال کے موجودگی میں جنرل باجوہ اور عمران خان کو بہت چالاکی سے حکمت عملی بنانی ہے کہ جس سے وہ امت کو کامیابی سے دھوکہ دے سکیں۔

درج ذیل میں جو بحث پیش کی جارہی ہے وہ اس غداری کی تفصیل ہے جو امت کو یہ یقین دلانے کے لیے کی جارہی ہے کہ ہم بھارت کو مجبور نہیں کرسکتے کہ وہ

آئین کے آرٹیکل 370 کی منسوخی کے فیصلے کو واپس لے۔

آئین کے آرٹیکل 370 اور 35A کی منسوخی بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کے انتخابی منشور اور اس کی انتخابی مہم کا ایک اہم حصہ تھا۔ لہٰذا پاکستان کی سیاسی و فوجی قیادت کے لیے 5 اگست 2019 کو بی جے پی کے جانب سے آئین کے ان آرٹیکلز کی منسوخی کوئی اچانک اور باعث حیرت عمل نہیں تھا۔ یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ، "پلوامہ حملے (14 فروری) کے دو دن بعد 16 فروری 2019 کو بھارتی قومی سلامتی کے مشیر اجیت دوول نے اپنے امریکی ہم منصب جان بولٹن کو فون کیا اور خصوصی حیثیت کے خاتمے کے حوالے سے منصوبے پر بات کی"[1]۔

لہٰذا امریکا بھارتی منصوبے سے باخبر تھا۔ بالاکوٹ کے واقع اور دو بھارتی جنگی طیاروں کو مار گرانے کے بعد بھارتی پائلٹ ابھی نندن کو پاکستان کی سیاسی و فوجی قیادت نے واپس بھیجنے میں جس جلد بازی کا مظاہرہ کیا ،اس کا مقصد کشیدگی کو نیچے لاتے ہوئے پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں صورتحال کو قابو میں رکھنا تھا۔ اگر پاکستان کی سیاسی و فوجی قیادت اس معاملے کو طول دیتی تو پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں بھارت مخالف جذبات میں شدید اضافہ ہوجاتا اور امت شاید فوجی ایکشن لینے پر مجبور کرتی۔ 8 اپریل 2019 کو ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کی صدر محبوبہ مفتی نے ، "۔۔۔ خبردار کیا کہ آرٹیکل 370 کی منسوخی ریاست (مقبوضہ کشمیر) کی بھارت سے آزادی کا سبب بنے گی"[2]۔

لہٰذا اس بات سے ہر ایک آگاہ تھا کہ بھارت آرٹیکل 370 کو منسوخ کرنے کی تیاری کررہا ہے۔ یہاں تک کہ نیشنل کانفرنس کے صدر فاروق عبداللہ نے وزیر اعظم نریندر مودی کو یہ کہتے ہوئے خبردار کیا کہ آرٹیکل 370 سے چھیڑ چھاڑ مت کرنا۔ اس طرح باجوہ کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ جب بھارت اپنے منصوبے پر عمل درآمد کی تیاری کررہا تھا تو دفتر خارجہ کا انڈین ڈیسک اور آئی آیس آئی کیا کررہے تھے؟ یہ معاملہ کچھ ویسا ہی ہے جب امریکا نے یکطرفہ طور پر پاکستان کی خودمختاری کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کو قتل کیا تھا۔ یہ کوئی بھول یا غلطی نہیں تھی بلکہ سازش میں شرکت تھی۔

وزیر اعظم عمران خان 20 جولائی 2019 کو امریکا کے دورے پر روانہ ہوئے اور ان کے ساتھ آرمی چیف جنرل باجوہ، ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل فیض حمید، مشیر خزانہ حفیظ شیخ اور مشیر تجارت عبدالرزاق داؤد بھی گئے جبکہ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی پہلے سے ہی واشنگٹن میں موجود تھے۔ بظاہر 22 جولائی 2019 کو باجوہ، عمران خان اور امریکی صدر ٹرمپ کے درمیان ہونے والی ملاقات میں زیادہ توجہ پاکستان کی معیشت، افغانستان اور جہادی گروہوں اور ان کی کارروائیوں کے خاتمے پر مرکوز رہی۔ لیکن ملاقات کے بعد ہونے والی بریفنگز میں دفتر خارجہ کے ایک سینئر افسر نے یہ انکشاف کیا، "فائنینشل ایکشن ٹاسک فورس (ایف اے ٹی ایف) کے تحت بین الاقوامی برادری کے ساتھ کیے گئے وعدوں کا پاکستان نے اعادہ کیا اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ دہشت گردی کے لیے فراہم کی جانی والی مالی معاونت کے خلاف سلسلہ وار اقدامات لیے جائیں گے تاکہ دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث افراد کو گرفتار اور ان کے خلاف مقدمے چلائے جاسکیں۔ یہ بات کل دفتر خارجہ کے ایک سینئر اہلکار نے کہی۔۔۔ ایک ایکشن پلان ہے جو کہ عمدہ، ٹھوس اور قابل پیمائش ہے۔۔۔ اور اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ایف اے ٹی ایف کے حوالے سے فرائض، وزیر اعظم کے 'نئے پاکستان' کے ویژن کا حصہ ہے۔ اہلکار نے مزید کہا۔۔۔ فوجی معاونت کی معطلی، غیر فوجی معاونت میں کمی، اور پچھلے دو سال کے دوران ہمارے سفارتی تعلقات میں کھچاؤ کو ختم کرنے کے حوالے سے اس حکومت اقدامات اس کی ترجیحات کی نشاندہی کرتے ہیں-جو کہ بھارت، اس خطے اور بین الاقوامی برادری کا بڑی حد تک مشترکہ ہدف ہے"[3]۔

آئی ایس آئی کے سربراہ اور عبدالحفیظ شیخ کی موجودگی اہم تھی۔ ٹرمپ کا معاملات کی نزاکت کو سمجھنے سے عاری ہونا اس کی جانب سے بات چیت کے دوران کشمیر کے حوالے سے ثالثی کی پیشکش سے ہوتا ہے۔ اس نے کہا، "دو ہفتے قبل میں وزیر اعظم مودی کے ساتھ تھا اور ہم نے اس موضوع کے متعلق بات کی اور اُس نے کہا 'کیا آپ ثالثی کا کردار ادا کرنا چاہیں گے'، میں نے پوچھا 'کہاں'، اس نے کہا 'کشمیر'۔ کیونکہ یہ معاملہ کئی سالوں سے چل رہا ہے"[4]۔

اہم بات یہ ہے کہ پہلی بار جموں و کشمیر میں بھارتی فوج میں اضافے کی خبر 26 جولائی 2019 کو سامنے آئی جب عمران اور ٹرمپ کی واشنگٹن میں ملاقات کو صرف تین دن ہی گزرے تھے۔ اگلے ایک ہفتے کے دوران تقریباً ایک لاکھ بھارتی افواج کو جموں و کشمیر منتقل کیا گیا۔ جس دن، 5 اگست 2019، کو بھارتی حکومت نے آئین کے آرٹیکل 370 اور 35A کو منسوخ کیا، اسی دن ایف اے ٹی ایف کے امریکی ماہرین کی ٹیم اسلام آباد پہنچی۔ اس دورے کا مقصد بظاہر اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ پاکستان 13 اگست کو اپنی رپورٹ جمع کرائے۔ 6 اگست 2019 کو عالمی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کے resident نمائندے ٹیریسا ڈبن نے ایک پریس کانفرنس میں کہا، "ایف اے ٹی ایف کی گرے لسٹ سے نکلنے میں ناکامی کی صورت میں حال ہی میں آئی ایم ایف کے ساتھ کیے

گئے 6 ارب ڈالر کا معاہدہ خطرے کا شکار ہو سکتا ہے"۔ اس نے مزید کہا، "۔۔۔ آئی ایم ایف مالیاتی نظام میں استحکام کا ذمہ دار ہے اور ایف اے ٹی ایف سے متعلق امور ٹیکس کے امور کو متاثر اور بینکنگ کے نظام کو کمزور کرتے ہیں"۔

ٹھیک 5 اگست کے اگلے ہی دن ایف اے ٹی ایف کے اس وفد کی آمد کا مقصد 5 اگست کی بھارتی اقدام کے خلاف افواج پاکستان کو جہادی تنظیموں کو حرکت میں لانے سے روکنا نہیں تھا کیونکہ باجوہ تو پہلے سے ہی انہیں ختم کرنے کا کام کر رہا تھا بلکہ اس دورے کا مقصد باجوہ کی بے عملی کو جواز فراہم کرنا تھا۔ ایف اے ٹی ایف کے اس دورے کا مقصد اثر ورسوخ رکھنے والے حلقوں میں غلط بیانیہ پھیلانے کے لیے معاونت فراہم کرنا تھا کہ دیکھیں ہماری معیشت اس حالت میں نہیں ہے کہ کسی بھی قسم کی جارحانہ پالیسی کے نتائج کو برداشت کر سکے یہاں تک کہ آئی ایم ایف سے ملنے والا قرض معطل بھی ہو سکتا ہے۔ تو مندرجہ بالا پیش کیے گئے اقوال امریکا کی جانب سے ڈالے جانے والے دباؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح مندرجہ بالا پیش کیے گئے ثبوت کہ بھارت نے پلوامہ حملے سے دو دن قبل ہی امریکا کو آرٹیکل 370 اور 35A منسوخ کرنے کے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا[5]، اس حقیقت نے مزید تنقید میں اضافہ کیا کہ امریکا اور باجوہ ایک ساتھ کام کر رہے ہیں۔

سیاسی وفوجی قیادت کی جانب سے اپنائے گئے دفاعی موقف کی امت نے شدید مخالفت کی۔ اس مخالفت کو ختم کرنے کے لیے ممکنہ ایٹمی جنگ کا بیانیہ پیش کیا گیا۔ تاریخ سے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ دو ایٹمی طاقتوں کے درمیان روایتی جنگ کبھی بھی ایٹمی جنگ میں تبدیل نہیں ہوئی بلکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ایٹمی طاقتیں روایتی جنگ شروع کرتی ہیں اور خود کو اسی تک محدود رکھتی ہیں۔ ممکنہ ایٹمی جنگ کے بیانیے نے جوابات سے زیادہ سوالات پیدا کر دیے۔ کوئی یہ بات کیسے کر سکتا ہے کہ جبکہ اس کے پاس ایٹمی ہتھیار بھی موجود ہوں کہ جنگ شروع ہوئی تو فوری طور پر خود بخود ایٹمی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی اور اسی لیے روایتی جنگ کی سوچ کو بھی قریب نہ آنے دیا جائے۔ عجیب مضحکہ خیز بات ہے کہ پاکستان نے لاکھوں ڈالر خرچ کر کے ایٹمی ہتھیار بنائے تا کہ بھارت کی روایتی جنگ میں برتری کو ختم کیا جا سکے لیکن اب یہ کہا جائے کہ ہم روایتی جنگ میں بھی ملوث نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ایٹمی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وجہ سے فوجی قیادت پر الزامات لگ رہے ہیں کہ وہ جنگ لڑ سکتے ہیں لیکن وہ درحقیقت لڑنا ہی نہیں چاہتے۔

تو پھر کس اصول کی بنیاد پر فوج خود کو جنگ میں اتارے گی؟ ہم سرحد پار دیکھتے ہیں کہ سادہ لوح طالبان نے یہ بات بالکل اچھی طرح سے سمجھ لی تھی کہ کس بات کے لیے لڑنا چاہیے اور قربانی دینی چاہیے۔ کیا انہوں نے امریکا کے سامنے جھکنے سے انکار نہیں کیا تھا؟ تو کیا ہم بھارت کے سامنے جھکنے سے انکار نہیں کر سکتے؟ مجاہدین کی طاقت کا سرچشمہ جہاد سے محبت ہے جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حکم ہے۔ اللہ کے قانون پر مکمل اعتماد ہونے کی وجہ مجاہدین ان ذرائع کو تلاش کرتے ہیں جن کے ذریعے وہ جہاد کے حکم کو نافذ کر سکیں اور اسی لیے وہ صرف چھوٹی موٹی جھڑپیں نہیں کرتے بلکہ دشمن کے خلاف پورے محاذ کو گرم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ سوچ اور طرز عمل ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بدر، احد، احزاب، قادسیہ اور کتنی ہی جنگوں میں کامیابیاں حاصل کیں تھیں۔ اس ذہنیت اور سوچ کی غیر موجودگی ہی آج ہماری کمزوری کی بنیادی وجہ ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ نبوت کے طریقے پر خلافت کے قیام کی جدوجہد کریں تا کہ مسلمانوں کو ایسی قیادت نصیب ہو جو ہمیں ایک کے بعد ایک کامیابی دلائے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا، **فَلاَ تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمْ الأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ** "تو تم ہمت نہ ہارو اور (دشمنوں کو) صلح کی طرف نہ بلاؤ۔ اور تمہی غالب ہو۔ اور اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ ہرگز تمہارے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا "(محمد 47:35)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **مَا تَرَكَ قَوْمٌ الْجِهَادَ إِلاّ ذُلّوا** "جس قوم نے جہاد چھوڑا وہ ذلیل ورسوا ہوئی"(احمد)۔

---

1 https://tribune.com.pk/story/2029616/9-us-knew-india-rob-occupied-kashmir-special-status/

2 https://timesofindia.indiatimes.com/elections/lok-sabha-elections-2019/jammu-and-kashmir/news/dont-play-with-fire-mehbooba-mufti-warns-bjp-on-article-370/articleshow/68782343.cms

3 https://www.thenews.com.pk/print/506917-improved-pak-us-ties-linked-to-irreversible-action-against-terrorists

4 https://www.thehindu.com/news/international/trump-offers-to-mediate-between-india-and-pakistan-on-kashmir/article28660299.ece

5 https://theprint.in/diplomacy/modi-govt-had-told-us-about-plans-to-scrap-article-370-twice-last-week-and-in-february/272652/

ختم شد

سوال وجواب: خلیفہ بننے کے لیے درکار شرائط میں "اہلیت" کا مطلب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال:

بسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، السلام علیکم ورحمة الله وبركاة

میرا ایک سوال ہے: اس کا تعلق کتاب اسلامی شخصیہ جلد 1 صفحہ 20 (عربی اشاعت) پر درج خلیفہ بننے کے لیے درکار سات شرائط میں سے ایک "اہلیت" سے ہے۔ یہاں پر 'اہلیت' کے معنوں کی وضاحت کی گئی ہے یہاں تک کہ بات اس نقطہ پر پہنچتی ہے:

"اس کے علاوہ یہ بات خلافت کے عقد کی لازمی شرائط میں سے نہیں ہے کہ خلیفہ بہادر ہو، یا گہری بصیرت رکھتا ہو تا کہ وہ معاشرے کے امور کی نگہبانی اور ان کے مفادات کو پورا کر سکے"۔

میرا سوال یہ ہے: کیا بہادری اور گہری بصیرت خلیفہ کی اہلیت کی شرائط میں شامل نہیں ہونی چاہیے؟

جواب:

وعلیم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کتاب میں درج کیا گیا متن یہ ہے: "اس کے علاوہ یہ بات خلافت کے عقد کی لازمی شرائط میں سے نہیں ہے کہ خلیفہ بہادر ہو، یا گہری بصیرت رکھتا ہو تا کہ وہ معاشرے کے امور کی نگہبانی اور ان کے مفادات کو پورا کر سکے"۔ ایسا اس لیے کہا گیا کیونکہ اس معاملے کے حوالے سے کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے، اور اس طرح یہ خصوصیات حکم شرعی کے تحت نہیں آتیں کہ اسے عقدcontract کا حصہ بنایا جائے۔ اگرچہ خلیفہ کا بہادر اور گہری بصیرت کا حامل ہونا قابل ترجیح خصوصیات ہیں۔ جیسا کہ آپ اچھی طرح سے جانتے ہوں گے کہ عقد کے لیے کسی شرط کا لازمی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر امت نے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کر لیا اور خلیفہ عقد کی لازمی شرائط میں سے صرف ایک شرط پر پورا نہ اترتا ہو تو اس کی خلافت خود بخود باطل ہو جاتی ہے۔ اب اگر ان دو خصوصیات کو دیکھا جائے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، تو یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ یہ شرائط عقد کی ان شرائط میں سے نہیں کہ جن کو پورا کیے بغیر عقد مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امت نے ایک ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کر لیا جس میں یہ دو شرائط موجود نہ ہو تو اس کے نتیجے میں اس کی خلافت باطل نہیں ہوتی۔ یہ فرق اس وجہ سے ہے کیونکہ شرعی دلائل اس بات کی جانب اشارہ نہیں کرتے۔ لیکن یقیناً یہ دو خصوصیت قابل ترجیح خصوصیات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جب خلیفہ کو منتخب کیا جا رہا ہو تو امت ان دو خصوصیات کو بھی لازمی مد نظر رکھے۔ امت کے لیے لازمی ہے کہ وہ خلیفہ کو منتخب کرتے وقت پوری توجہ اس معاملے پر مرکوز رکھے تا کہ وہ شخص خلیفہ منتخب ہو جو نہ صرف لازمی شرائط پر پورا اترتا ہو بلکہ جتنی بھی قابل ترجیح شرائط ہیں وہ ان پر بھی زیادہ سے زیادہ پورا اترتا ہو، اور اسی میں ہماری بہتری اور طاقت ہے۔

جہاں تک "اہلیت" کی خصوصیت کا تعلق ہے تو یہ لازمی شرائط میں سے ایک ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ لازمی اہل ہو تا کہ وہ خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے، اور یہاں "اہلیت" کو واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے۔ تو کوئی بھی ایسا معاملہ جس کی وجہ سے خلیفہ خلافت کی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے انجام نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہی لیا جائے گا کہ وہ اہلیت کی لازمی شرط پر پورا نہیں اترتا۔ "اہلیت" کی شرط اس لیے لازمی ہے کہ خلیفہ کی واحد ذمہ داری یہ ہے کہ وہ شریعت کے احکام کو نافذ کرے۔ اسی وجہ سے یہ لازمی ہے کہ اس میں یہ اہلیت موجود ہو کہ وہ احکامات دے سکے، ان کا جائزہ لے سکے اور اس بات کو یقینی بنا سکے کہ وہ لوگ جن کو اس نے حکم دیا ہے وہ اس حکم کو نافذ بھی کر رہے ہوں۔ اسی طرح اگر وہ احکامات دینے میں ناکام رہتا ہے یا ان پر عمل درآمد کروانے میں ناکام رہتا ہے تو وہ خلافت کے عقد کو پورا نہیں کر سکتا جس کے لیے اسے تعینات کیا گیا ہے یعنی کہ احکام شریعت کا نفاذ۔

تو اہلیت کی غیر موجودگی میں خلافت کا عقد باطل ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر خلیفہ نسیان (بھولنے) کے مرض میں مبتلا ہو جائے یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے جس سے نکلنے میں طویل عرصہ لگتا ہے یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے جو اتنے طویل عرصے تک چلتا ہے کہ جس سے ریاست کے امور متاثر ہونا شروع ہو جائیں اس حد تک کہ خلیفہ اپنے امور خود انجام نہ دے سکے اور اپنے احکامات کا جائزہ نہ لے سکے جو اس نے دوسروں کو جاری کیے ہوں، تو اس قسم کی کسی بھی صورت میں مظالم کی عدالت خلیفہ کی صورتحال کو جاننے کے لیے کارروائی شروع کرے گی اور حقیقت حال جاننے کے بعد خلیفہ کے منصب کو خالی قرار دے گی۔

جہاں تک قابل ترجیح شرائط پر پورا نہ اترنے کی بات ہے تو اس کے نتیجے میں خلافت کا عقد باطل نہیں ہوتا۔

بقیہ صفحہ 14 پر

سوال وجواب: سونے اور چاندی کے ذخائر کو استعمال میں لانا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال:

ہماری کتاب اقتصادی بحران کی روشنی میں کرنسی کے بارے میں آراء درکار ہے

ا۔اگر بہت بڑی تعداد میں سونے اور چاندی کی کانیں نکل آئیں تو ریاست پابند ہے کہ تمام سونا اور چاندی نکال کر ان کو کرنسی کے طور پر جاری کرے یا ریاست ان کو نہیں نکالے گی تاکہ کرنسی کے تبادلے میں استحکام رہے؟

۲۔ریاست خلافت عملی طور ہر کس طرح سونے اور چاندی کے معیار کو کرنسی کے طور پر چلائے گی ؟ مثال:ریاست میں اگر سونے اور چاندی کی کانین نہ ہونے کے برابر ہوں ، تو اس صورتحال میں ریاست سونے اور چاندی پر مبنی پیپر کرنسی ایشو کرے گی ؟ یا پیپر کرنسی کو سونے اور چاندی کے علاوہ دوسرے اثاثہ جات کی بنیاد پر بھی جاری کر سکتی ہے جن تک اس کے پاس سونے اور چاندی کے ذخائر نہیں آتے ؟

جواب:

ا۔ سونے اور چاندی کے ذخائر کانوں سے نکالنا ریاست کی ذمہ داری ہوگی کیونکہ نہ صرف یہ کہ قانونی کرنسی کا معاملہ ہے بلکہ یہ عوامی ملکیت میں شامل ہے،ریاست یہ ذخائر اپنی ضرورت کے حساب سے ہی کانوں سے نکالے گی۔مندرجہ ذیل شرعی احکامات کی وجہ سے یہ توازن خود بہ خود وجود میں آجاتا ہے:

کرنسی صرف سونے اور چاندی پر مبنی ہوگی

قیمتوں کا سرکاری سطح پر تعین کرنا منع ہے، ذخیرہ اندرونی جائز نہیں،اگر کسی شے کی قلت کسی ولایہ میں ہو بھی جاتی ہے تو ریاست دوسری ولایات سے وہ شے کی خطیر یا ضرورت کے مطابق مقدار منگوا کر مارکیٹ تک پہنچائے گی۔

تمام مندرجہ بالا احکامات کی وجہ سے سونے اور چاندی کو نکالے کا عمل ضرورت کے مطابق ہی رہے گا،اور سونے اور چاندی پر کرنسی مبنی ہونے کی وجہ سے مہنگائی اور افراط زرنہ ہونے کے برابر ہوگا ۔جیسا کہ "اقتصادی بحران" کی کتاب میں لکھا ہے "یہ نظام شئے کی قیمت کو استحکام دیتا ہے داخلی اور خارجی دونوں سطح پر اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے سونے کی جو قیمت ۱۸۹۰ء میں تھی وہی قیمت ۱۹۱۰ء میں بھی تھی" ۔

۲۔ یہ مفروضہ کہ ہماری اسلامی سرزمین پر سونے اور چاندی کی کانوں کی قلت ہے ! حقیقت پر مبنی نہیں بے شمار سونے اور چاندی کی کانیں ہیں ساتھ ہی ہمارے پاس وہ اشیاء بھی وافر طور پر موجو دہے جس کی دوسرے ممالک کو بے انتہا ضرورت ہے جیسا کہ تیل و گیس،یہ اشیاء ہم صرف سونے اور چاندی کے بدلے یا اپنی ضرورت کی اشیاء کے بدلے ہی فراہم کریں گے، ساتھ ہی ہماری ایک خطیر موجودہ کاغذی کرنسی بھی ان کے بینکوں میں پڑی ہے جس کو ہم اپنی ضرورت کی اشیاء سے تبدیل کریں گے، ہماری زمینیں بنیادی ضروریات کی پیداوار کے لحاظ سے خود کفیل ہے، پس ان کی پابندیاں ہم پر اثرانداز نہیں ہونگی ، اگر وہ پابندیوں کو ہمارے خلاف استعمال کرنا چاہیں ،الٹا ان پابندیوں کی وجہ سے ان ممالک کو زیادہ نقصان ہوگا ،اسی طرح ہمارے بینکوں میں بھی کرنسی موجودہ ہے ۔یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں وافر مقدار میں ہماری مسلم سرزمینوں پر بھری پڑی ہیں ۔

یقین رکھیں، قطعاً مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ سے جلد نصرت کی دعا کریں، وہی طاقتور اور عزیز ہے۔

۲ ربیع الاول ۱۴۳۴ ہجری

بمطابق: 2013-01-14

ختم شد

سوال وجواب: اسلام میں محصن (شادی شدہ) زانی کی سزا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال:

السلام علیکم، میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، امید کرتا ہو کہ آپ اس کا جواب دیں گے۔

محصن (شادی شدہ) زانی کے لیے موت کی سزا کے حوالے سے پوچھنا تھا کہ کیا یہ اسلامی فقہ میں قطعی ہے؟ کچھ علماء ہیں جیسا کہ شیخ ابو زہرا جو اسے حدود کی سزا کی طور پر نہیں دیکھتے۔ اس موقف کی حمایت شیخ مصطفیٰ زرقا بھی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سزا تعزیر کے تحت آتی ہے۔ آپ اس معاملے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جزاک اللہ خیراً

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

آپ محصن (شادی شدہ) زانی کی سزا کے متعلق پوچھ رہے ہیں کہ آیا یہ سزا اسلامی فقہ میں قطعی ہے؟ کیا اس کا تعلق حدود کی سزاوں سے ہے، یا یہ کہ اس کا تعلق حدود سے نہیں بلکہ تعزیر سے ہے جیسا کہ آج کے کچھ علماء اسے تعزیر کی سزا سمجھتے ہیں؟

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے:

1۔ محصن (شادی شدہ) زانی کو پتھر مار نے (سنگسار) کے ذریعے موت کی سزا کا تعلق عقائد سے نہیں بلکہ شرعی احکام سے ہے۔ تمام دیگر شرعی احکامات کی طرح اس حکم کے لیے بھی دلیل کا قطعی ہونا لازمی

محصن (شادی شدہ) زانی کو پتھر مار نے (سنگسار) کے ذریعے موت کی سزا کا تعلق عقائد سے نہیں بلکہ شرعی احکام سے ہے۔ تمام دیگر شرعی احکامات کی طرح اس حکم کے لیے بھی دلیل کا قطعی ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ غلبۂ ظن کی بنیاد پر حکم شرعی کو اختیار کرنا کافی ہے اور یہ اصول اسلامی فقہ کا مشہور و معروف اصول ہے۔۔۔ لہٰذا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس سزا کی دلیل قطعی ہے یا غیر قطعی (ظنی) ہے لیکن یہ بات اہم ہے کہ اس سزا کی ایک شرعی دلیل ہو، اور شرع میں کئی درست دلائل موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ محصن زانی کی سزا پتھر مار کر (سنگسار) قتل کرنا ہے۔

نہیں ہے بلکہ غلبۂ ظن کی بنیاد پر حکم شرعی کو اختیار کرنا کافی ہے اور یہ اصول اسلامی فقہ کا مشہور ومعروف اصول ہے۔۔۔ لہٰذا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس سزا کی دلیل قطعی ہے یا غیر قطعی (ظنی) ہے لیکن یہ بات اہم ہے کہ اس سزا کی ایک شرعی دلیل ہو، اور شرع میں کئی درست دلائل موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ محصن زانی کی سزا پتھر مار کر (سنگسار) قتل کرنا ہے جیسا کہ نیچے بیان کیا گیا ہے۔

2۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ موجودہ دور کے کچھ علماء دلائل (دلیل کی جمع) سے صحیح اسلامی احکامات کو اخذ کرنے کے لیے درست طریقہ کار کی پیروی نہیں کر رہے، لہٰذا وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ایسا اسلامی حکم تلاش کیا جائے جو موجودہ حالات اور مغربی ثقافت نے دنیا میں لوگوں پر بین الاقوامی قوانین کے نام پر جو کچھ لاگو کیا ہے، اور انسانی حقوق کے کنونشنز اور دیگر قوانین کے مطابق ہو۔۔۔ یہ طریقہ کار درست نہیں ہے کیونکہ جس چیز کی تلاش ہے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم ہے نہ کہ کوئی بھی حکم، اور نہ ہی ایسا حکم جو دنیا میں رائج مروجہ قوانین سے مطابقت رکھتا ہو۔۔۔ ذمہ داری یہ ہے کہ شرعی دلائل سے حکم شرعی معلوم کیا جائے، اسے نافذ کیا جائے اور اس کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے اور اسے پوری دنیا میں پھیلایا جائے۔ یہ پوری انسانیت کے لیے ایک درست حکم ہوتا ہے کیونکہ اس حکم کو دینے والا انسانوں کا خالق ہے جو ان کے حالات سے باخبر ہے، **أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ** " بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے؟ وہ تو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا اور (ہر چیز سے) آگاہ ہے "(الملک،67:14)، **أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ** " دیکھو سب مخلوق

بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے)۔ یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے "(الاعراف،7:54)۔

لہٰذا ہمیں ان لوگوں کی باتیں نہیں سننی چاہیے جو وقت کے ساتھ چلنا اور مغربی ثقافت کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے، چاہے وہ یہ عمل حقیقت کے دباؤ کے پیش نظر کرتے ہوں یا مغربی کفار کو کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہوں۔۔۔

3۔ محصن زانی کی سزا پتھر مار کر (سنگسار) قتل کرنا اور غیر محصن (غیر شادی شدہ) زانی کی سزا سو کوڑے ہے، یہ حدود کے تحت دی جانے والی اسلامی سزائیں ہیں۔ ہم نے کتاب "نظامِ عقوبات" میں زنا کی حد کے حوالے سے کافی تفصیلات اور وضاحت پیش کی ہے اور میں اسی کتاب کے کے ایک حصے "زنا کی حد" سے کچھ پیش کرتا ہو: کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ محصن اور غیر محصن مرد اور عورت زانی کی سزا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق 100 کوڑے ہے: **الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللهِ** " بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد (جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو) دونوں میں سے ہر ایک کو سو دُرے مارو، اور اللہ (کے حکم) میں تمہیں ان پر ہر گز ترس نہ آئے "(النور،24:2)۔

وہ یہ کہتے ہیں کہ اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ کتاب اللہ کے یقینی اور قطعی حکم کو ایک فردِ واحد کی روایت (خبر آحد) پر چھوڑا نہیں جاسکتا جہاں غلطی کی گنجائش موجود ہے اور اس طرح سنت کے ذریعے کتاب اللہ کو مسترد کرنے کا ذریعہ مہیا ہوتا ہے، جس کی اجازت نہیں ہے۔

صحابہؓ، تابعین اور ان کے بعد کئی نسلوں تک مختلف علاقوں میں دین کا علم رکھنے والے افراد یہی موقف رکھتے تھے کہ غیر محصن (غیر شادی شدہ) زانی کی سزا 100 کوڑے جبکہ محصن (شادی شدہ) زانی کی سزا سنگسار کے ذریعے موت ہے۔ یہ موقف اس لیے اختیار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز کو سنگساری کی سزا دی اور جابر بن عبد اللہؓ کی روایت کے مطابق "ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا، لہٰذا محمد ﷺ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اسے کوڑے مارے گئے، پھر اس نے بتایا کہ وہ محصن (شادی شدہ) ہے، تو آپ ﷺ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اسے سنگسار کیا گیا"۔

صحابہؓ، تابعین اور ان کے بعد کئی نسلوں تک مختلف علاقوں میں دین کا علم رکھنے والے افراد یہی موقف رکھتے تھے کہ غیر محصن (غیر شادی شدہ) زانی کی سزا 100 کوڑے جبکہ محصن (شادی شدہ) زانی کی سزا سنگسار کے ذریعے موت ہے۔ یہ موقف اس لیے اختیار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز کو سنگساری کی سزا دی اور جابر بن عبد اللہؓ کی روایت کے مطابق "ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا، لہٰذا محمد ﷺ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اسے کوڑے مارے گئے، پھر اس نے بتایا کہ وہ محصن (شادی شدہ) ہے، تو آپ ﷺ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اسے سنگسار کیا گیا"۔

وہ جو دلائل کا جائزہ لیتے ہیں وہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا یہ فرمان ایک عمومی حکم ہے، **الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللهِ** " بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد (جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو) دونوں میں سے ہر ایک کو سو دُرے (کوڑے) مارو "(النور24:2)۔ ایسا اس لیے ہے کیونکہ لفظ 'زانی' (مرد) اور 'زانیہ' (عورت) ان الفاظ میں سے ہے جو عمومیت کے لحاظ سے استعمال ہوتے ہیں، لہٰذا اس میں محصن اور غیر محصن دونوں شامل ہیں۔ جب حدیث آئی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **واغد يا أُنيْس إلى امرأة هذا فإن اعترفت فارجمها** "اے انیس، کل اُس عورت کے پاس جاؤ۔ اگر وہ جرم تسلیم کر لیتی ہے تو اسے سنگسار کر دو"، اور یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز کو سنگسار کیا یہ پوچھنے کے بعد کہ کیا وہ شادی شدہ ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے غامدیہ کو سنگسار کیا اور اس کے علاوہ بھی متعدد صحیح احادیث اس حوالے سے موجود ہیں۔ تو اس طرح حدیث نے آیت کو مخصوص کر دیا۔ لہٰذا ان احادیث نے آیت کے "عمومی" معنوں کو محصن (شادی شدہ) کے علاوہ افراد کے لیے "مخصوص

"کر دیا اور آیت کے معنی سے محصن کو خارج کر دیا۔ اسی طرح ان احادیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ نہیں بلکہ آیت کے عمومی معنوں کو مخصوص کر دیا۔ قرآن کی آیت کو سنت کے ذریعے مخصوص کرنے کی اجازت ہے اور یہ معاملہ کئی آیات میں پیش آیا ہے کہ جہاں آیت عمومی معنوں کے ساتھ نازل ہوئی اور حدیث نے اسے مخصوص کر دیا۔

حکم شرعی، جس کی طرف شرعی دلائل یعنی قرآن و سنت اشارہ کرتے ہیں، یہ ہے کہ قرآن کے مطابق غیر محصن زانی کی سزا 100 کوڑے مارنا ہے اور سنت کے مطابق اسے ایک سال کے لیے جلا وطن بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جلاوطنی کی سزا دینا لازمی نہیں ہے البتہ اس کی اجازت ہے۔ اس بات کا فیصلہ امام (حکمران) پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو غیر محصن زانی کو کوڑے مارے اور جلا وطن بھی کرے اور اگر چاہے تو صرف کوڑے مارے لیکن جلا وطن نہ کرے۔ لیکن اس بات کی اجازت نہیں کہ اسے کوڑے مارے بغیر جلاوطن کر دیا جائے کیونکہ فرض سزا کوڑے مارنا ہے۔

جہاں تک محصن (شادی شدہ) زانی کی سزا کا تعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ کے مطابق اُس پر اُس وقت تک پتھر مارے جائیں گے جب تک کہ اس کی موت واقع نہ ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت نے قرآنی آیت کے عمومی حکم کو مخصوص کر دیا۔ اس بات کی اجازت ہے کہ محصن زانی کو پہلے کوڑے ماریں جائیں اور پھر سنگسار کیا جائے۔ اس بات کی بھی اجازت ہے کہ اسے کوڑے مارے بغیر صرف سنگسار کیا جائے۔ لیکن اس بات کی اجازت نہیں کہ اسے صرف کوڑے مارے جائیں کیونکہ فرض سزا سنگسار کرنا ہے۔

جہاں تک محصن زانی کی سزا کے دلائل (دلیل کی جمع) کا تعلق ہے تو اس حوالے سے

جہاں تک محصن (شادی شدہ) زانی کی سزا کا تعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ کے مطابق اُس پر اُس وقت تک پتھر مارے جائیں گے جب تک کہ اس کی موت واقع نہ ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت نے قرآنی آیت کے عمومی حکم کو مخصوص کر دیا۔ اس بات کی اجازت ہے کہ محصن زانی کو پہلے کوڑے ماریں جائیں اور پھر سنگسار کیا جائے۔ اس بات کی بھی اجازت ہے کہ اسے کوڑے مارے بغیر صرف سنگسار کیا جائے۔ لیکن اس بات کی اجازت نہیں کہ اسے صرف کوڑے مارے جائیں کیونکہ فرض سزا سنگسار کرنا ہے۔

کئی احادیث موجود ہیں۔ ابو ہریرہ اور زید بن خالد سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ایک بدو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا، "اے اللہ کے رسول، میں آپ سے اللہ کے واسطے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ صرف کتاب اللہ کی بنیاد پر فیصلہ کریں۔ دوسرے فریق، جو اس بدو سے زیادہ علم رکھتا تھا، نے بھی کہا کہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ کتاب اللہ کی بنیاد پر کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بولو۔ اس نے کہا، میرا بیٹا اس شخص کا ملازم تھا اور اُس نے اِس شخص کی بیوی کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے بیٹے کی سزا سنگسار کرنا ہے، لہٰذا میں نے اسے سو بھیڑوں اور نومولود بھیڑوں کی صورت میں تاوان دیا۔ پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کی سزا 100 کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اس (عورت) کے لیے سنگساری کی سزا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا، **والذي نفسي بيده لأقضين بينكما بكتاب الله، الوليدة والغنم ردّ، وعلى ابنك جلد مائة، وتغريب عام، واغدُ يا أنيس - لرجل من أسلم - إلى امرأة هذا فإن اعترفت فارجمها، قال: فغدا عليها فاعترفت فأمر بها رسول الله صلى الله عليه وسلم فرجمت**" جس ذات کے قبضے میں میری جان ہے، یقیناً میں کتاب اللہ کی بنیاد پر تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا۔ بھیڑیں اور نومولود بھیڑیں واپس کی جائیں اور تمہارے بیٹے کے لیے 100 کوڑے اور ایک سال کی جلاطنی کی سزا ہے۔ اے انیس (آپ ﷺ نے قبیلہ اسلم کے فرد سے کہا) اس شخص کی بیوی کے پاس کل جاؤ اور اگر وہ جرم تسلیم کرتی ہے تو اسے سنگسار کر دو۔ وہ شخص اس عورت کے پاس گیا اور عورت نے جرم تسلیم کیا لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور اسے سنگسار کیا گیا"۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے محصن زانیہ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا اور اسے

کوڑے نہیں مارے۔ شعبی سے روایت ہے کہ جب علیؓ نے ایک عورت کو سنگسار کیا تو اس سے قبل جمعرات کو اسے کوڑے مارے اور جمعہ کو اسے سنگسار کیا اور کہا، میں نے اسے کتاب اللہ کے مطابق کوڑے مارے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق سنگسار کیا۔ عبادۃ بن صامت نے روایت کی کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **خذوا عني، خذوا عني، قد جعل الله لهن سبيلاً البكر بالبكر جلد مائة ونفي سنة، والثيب بالثيب جلد مائة والرجم** " مجھ سے سیکھ لو، سیکھ لو مجھ سے(شرع کی باتیں)،اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے ایک راہ نکالی جب **'بکر'**(غیر شادی شدہ)زنا کرے تو **'بکر'** (غیر شادی شدہ)کو سو کوڑے لگاؤ اور ایک سال کے لئے علاقے سے باہر کر دو اور اگر **'ثیب'**(شادی شدہ) **'ثیب'** (شادی شدہ) سے زنا کرے، تو **ثیب** کو سو کوڑے لگاؤ پھر پتھروں سے مارڈالو "۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ محصن زانی کی سزا کوڑے اور سنگسار کرنا ہے، اور علیؓ نے محصن زانیہ کو کوڑے مارے اور سنگسار کیا۔ جابر بن سمرہؓ نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز کو سنگسار کیا اور کوڑے مارنے کا ذکر نہیں کیا۔ بخاری نے سلیمان بن بریدہؓ سے روایت کی کہ پیغمبر ﷺ نے غامدیہ کو سنگسار کیا۔اور کوڑے مارنے کا ذکر نہیں کیا۔ مسلم نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہینہ کی عورت کے متعلق حکم جاری کیا، لہٰذا اس کے کپڑے اس کے گرد مضبوطی سے باندھ دیے گئے اور پھر اسے سنگسار کیا گیا، اور اس روایت میں بھی کوڑے مارنے کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زانی و زانیہ کو سنگسار کیا مگر کوڑے نہیں مارے، اور آپ ﷺ نے فرمایا، **الثيب بالثيب جلد مائة والرجم**"اگر ثیب(شادی شدہ) ثیب (شادی شدہ) سے زنا کرے، تو ثیب کو سو کوڑے لگاؤ پھر پتھروں سے مارڈالو "۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگساری فرض ہے جبکہ کوڑے مارنے کی اجازت ہے اور اس معاملے کو خلیفہ کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ کوڑوں کی سزا دے یا نہ دے۔ محصن زانی کی "حد" کوڑے لگانے کے ساتھ سنگساری ہے اگر احادیث کو جمع کیا جائے۔ کسی نے بھی سمرہ کی حدیث کے متعلق یہ نہیں کہا کہ آپ ﷺ نے ماعز کو کوڑے نہیں مارے بلکہ خود کو سنگساری تک محدود رکھا لہٰذا یہ حدیث عبادہ بن صامت کی حدیث کو ختم کر دیتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ، **الثيب بالثيب جلد مائة والرجم** " اگر ثیب(شادی شدہ) ثیب(شادی شدہ) سے زنا کرے، تو ثیب کو سو کوڑے لگاؤ پھر پتھروں سے مارڈالو "۔ کسی کو یہ نہیں کہنا چاہیے کیونکہ ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ماعز کی حدیث عبادہ کی حدیث کے بعد آئی ہے۔ ان دو حدیثوں سے متعلق اس طرح کے کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں، کوڑوں کا ذکر نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس حکم کو چھوڑ دیا گیا یا ختم کر دیا گیا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہ ہونا کہ یہ دو احادیث ایک دوسرے کے آگے پیچھے آئی ہیں، اس بحث کو ختم کر دیتا ہے کہ پہلی حدیث سے اخذ ہونے والا حکم ختم ہو گیا، اور نہ ہی کوئی ایسا ثبوت ملتا ہے جس کی وجہ سے ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دی جائے۔ حدیث میں سنگسار کرنے کے علاوہ جب کوڑے مارنے کا ذکر کیا گیا تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی اجازت ہے لیکن اس سزا کو دینا فرض نہیں ہے۔ احادیث کو جمع کرنے سے حکم یہ نکلتا ہے کہ سنگسار کرنا فرض ہے اور جو اس سے زائد ہے اس پر عمل کرنا خلیفہ کی مرضی سے مشروط ہے۔)۔ کتاب "نظامِ عقوبات" سے اقتباس ختم ہوا۔

خلاصہ یہ ہے: محصن زانی (شادی شدہ بدکار) کی سزا سنگسار کر کے موت ہے جس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے جس کا ذکر دو صحیحات اور کئی دیگر احادیث کی کتب میں آیا ہے۔ یہ سزا حدود کی سزاؤں میں سے ایک سزا ہے اور اس کا تعلق تعزیر سے نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر جاننے والا ہے اور وہ تمام تر سمجھ رکھتا ہے۔

آپ کا بھائی

عطا بن خلیل ابو الرَشتہ

12 محرم 1441 ہجری،

بمطابق 11 ستمبر 2019 عیسوی

ختم شد

حزب التحریر ولایہ بنگلادیش کے مظاہرے اور ریلیاں!
بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کے بھارتی 'ہندوتوا' جارحیت اور حسینہ واجد حکومت کی مودی سرکار کے سامنے بزدلانہ موقف کے خلاف احتجاج

پریس ریلیز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

15 نومبر 2019 بروز جمعہ بعد نماز جمعہ حزب التحریر ولایہ بنگلادیش نے ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی کئی مساجد کے باہر مظاہرے اور ریلیاں منعقد کیے۔ یہ مظاہرے اور ریلیاں بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کی صورت میں بھارتی 'ہندوتوا' جارحیت اور اس جارحیت کے سامنے حسینہ حکومت کے جھک جانے کے خلاف کیے گئے۔ یہ مظاہرے مساجد کے باہر سے شروع ہوئے اور شہر کی کئی سڑکوں پر مارچ کرنے کے بعد اختتام پزیر ہوئے۔ مساجد جانے والے لوگوں نے اس مظاہروں کی حمایت کی اور بھارتی ہندوتوا جارحیت اور اس کے سامنے حسینہ حکومت کے جھک جانے کے خلاف نعروں کے ذریعے اپنے غم وغصے کا اظہار کیا۔

مظاہروں سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ 'ہندوتوا' نظریے کے تحت مغرب کا ایجنٹ بھارت اپنے ناپاک علاقائی عزائم کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس عمل میں اسے امریکا کی بھر پور حمایت حاصل ہے تا کہ وہ اس خطے میں اپنے ایجنٹ بھارت کو بالکل ویسے ہی مضبوط کر سکے جیسا کہ اس نے مشرقی وسطی میں ناجائز یہودی وجود کو طاقت فراہم کر کے مضبوط کیا ہے۔ جس طرح مغربی استعمار نے کمزور ناجائز یہودی وجود کو مسلم دنیا کے غدار حکمرانوں کی مدد سے ناقابل تسخیر بنا کر پیش کیا، بالکل ویسی ہی حکمت عملی مسلم دنیا کے غدار حکمرانوں کی مدد سے مغربی استعمار نے بزدل بھارت کو خطے میں بہت بڑی طاقتور ریاست بنا کر پیش کرنے کے لیے اپنائی ہے تا کہ امت اس صورتحال کو قبول کرلے اور دوسری خلافت راشدہ کی واپسی کے حوالے سے مایوس اور ناامید ہوجائے۔ لہذا بھارت بغیر کسی مزاحمت کے مسلمانوں کے خلاف ایک کے بعد ایک اپنے جارحانہ منصوبوں پر عمل کر رہا ہے جبکہ مسلم دنیا کے بزدل اور کمزور حکمران اپنے غدارانہ عمل کے ذریعے بھارت کے منصوبوں کو قانونی حیثیت فراہم کر رہے ہیں۔ ہم نے متحدہ عرب امارات کے غدار حکمرانوں کا طرز عمل دیکھا جنہوں نے قصائی مودی کو اس وقت اپنا سب سے بڑا شہری اعزاز دیا جب کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے کے بھارتی اعلان کو چند ہی دن گزرے تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح پاکستان کی طاقتور افواج کو عمران خان نے جہاد کرنے سے روک دیا اور امت کی توجہ ہٹانے کے لیے تقریروں اور ٹویٹس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور اسی طرح دھوکے باز حسینہ حکومت نے بابری مسجد پر امت کے جذبات کی ترجمانی کرنے کی جگہ یہ کہا کہ یہ بھارت کا اندرونی معاملہ ہے اور اس حوالے سے وہ ملک میں کسی بھی قسم کی تحریک کو برداشت نہیں کریں گی۔

حسینہ حکومت کے کردار پر شدید تنقید اور مسلمانوں کو خلافت کے قیام کی دعوت دیتے ہوئے مقررین نے کہا کہ اس بابری مسجد کے لیے دو ہزار سے زائد مسلمانوں نے اپنے جانیں نچھاور کیں اور حسینہ حکومت یہ کہہ رہی ہے کہ بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر بھارت کا اندرونی معاملہ ہے! امریکا، برطانیہ اور بھارت کی ایجنٹ اس حکومت کے لیے مسلمانوں کا خون، عزت اور عبادت گاہیں اس قدر سستی ہیں کہ یہ اس کے بدلے مشرک بھارت کو خوش کر رہے ہیں۔ یہ حکومت چاہتی ہے کہ ہم نام نہاد طاقتور بھارت کی بالادستی قبول اور خطے میں ہندوتوا کے غلبے کی کوششوں پر خاموشی اختیار کرلیں۔ لہٰذا اس ذلت و رسوائی سے نکل کر دوبارہ عزت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ غدار حسینہ حکومت کو ہٹایا جائے جو کہ صرف اور صرف استعماریوں کے جیو اسٹریٹیجک مفادات کے حصول کے لیے مسلمانوں کے خلاف مشرک بھارت کی جنگ میں اس کی مدد کر رہی ہے۔

بقیہ صفحہ 6 پر

হিযবুত তাহ্‌রীর, উলাই'য়াহ্ বাংলাদেশ

বাদার্স ফার্ণিচার
ভারতের হিন্দুত্ববাদের মুখে নতজানু বিশ্বাসঘাতক শাসকগোষ্ঠীকে
অপসারণ করে খিলাফতে রাশিদাহ্ পুনঃপ্রতিষ্ঠা করুন
এটাই বাবরি মসজিদের সম্মান পুনরুদ্ধারের একমাত্র নিশ্চিত পথ
হিযবুত তাহ্‌রীর, উলাই'য়াহ্ বাংলাদেশ

مسلم دنیا میں اردو بولنے والوں کے لیے

حزب التحریر کے مرکزی میڈیا آفس کی اردو ویب سائٹ

www.hizb-ut-tahrir.info/info/urdu.php

حزب التحریر کے مرکزی میڈیا آفس کی ایک اردو ویب سائٹ ہے جس کو www.hizb-ut-tahrir.info کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی امت میں اردو بولنے، لکھنے اور سمجھنے والے کروڑوں مسلمانوں کے لئے یہ اردو ویب سائٹ معلومات حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس ویب سائٹ پر پوری مسلم دنیا میں خلافت کے قیام کے لیے کام کرنے والی جماعت حزب التحریر کی انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک مختلف ولایات کی جانب سے جاری کی گئیں پریس ریلیز اور لیفلٹ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ویب سائٹ پر مسلم دنیا میں حزب التحریر کی خلافت کے قیام کی زبردست جدوجہد کے حوالے سے تحریریں، تصاویر، آڈیوز اور ویڈیوز بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ویب سائٹ کے ذریعے حزب التحریر کے امیر، مشہور رہنما اور فقیہ، شیخ عطا بن خلیل ابوالرَشتہ سے سوالات بھی پوچھے جاسکتے ہیں۔

یقیناً اردو زبان کی موجودگی خلافت کا تحفہ ہے کیونکہ یہ زبان ریاستِ خلافت کی مسلم افواج کی فوجی چھاؤنیوں میں وجود میں آئی تھی جن میں ترکی، فارس، عرب اور برِصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے مسلمان موجود ہوتے تھے۔ درحقیقت لفظ اردو ترک زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "لشکر" کے ہیں۔ آج کے دن تک اردو کا رسم الخط، اس کے الفاظ اور طرزِ تحریر قرآن اور خلافت کی سرکاری زبان عربی پر بے حد انحصار کرتی ہے۔

حزب التحریر ولایہ پاکستان اردو زبان استعمال کرنے والے صحافیوں، میڈیا اور سوشل میڈیا کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ حزب التحریر کی جدوجہد اور کام سے مسلسل آگاہی کے لیے اس بہترین ویب سائٹ کو استعمال کریں۔

ولایہ پاکستان میں حزب التحریر کا میڈیا آفس